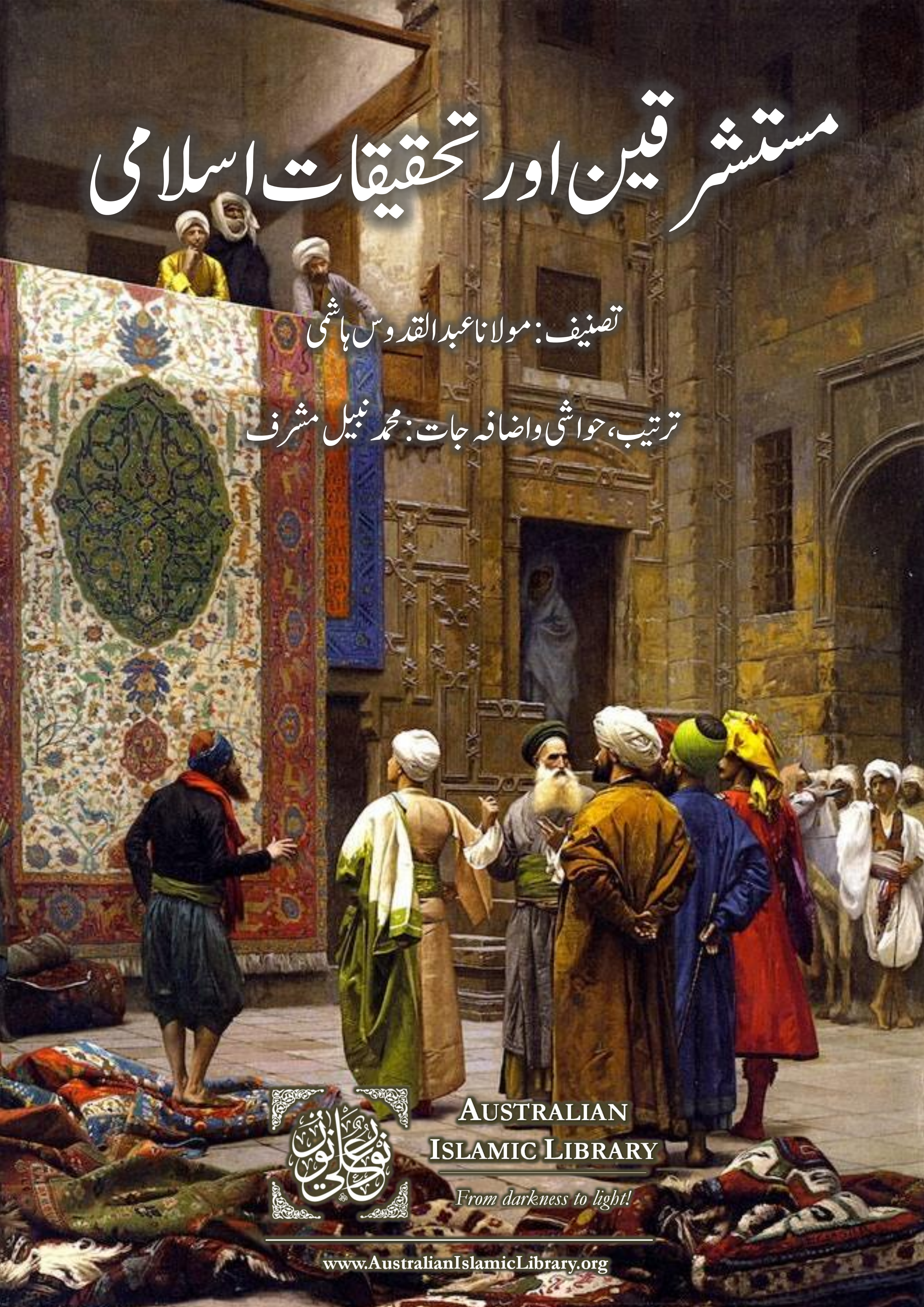


مستشرقین اور تحقیقات اسلامی

تصنیف: مولانا عبدالقدوس ہاشمی

ترتیب، حواشی و اضافہ جات: محمد نبیل مشرف

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

فہرست

مطالعہ کے لئے درکار اوسط وقت



ایک عام انسان 1 منٹ میں تقریباً 2 صفحات کا باآسانی مطالعہ کر سکتا ہے۔
اگر آپ سمجھ کر پڑھنے کے لئے اس سے دوگنا وقت بھی لگائیں تو تقریباً آدھا گھنٹا درکار ہوگا۔

نوٹ:

سرخ فونٹ میں لکھے گئے حصے اور حواشی اضافاجات ہیں۔

مستشرقین اور تحقیقات اسلامی

از قلم: مولانا عبد القدوس ہاشمی

تعارفِ کتاب:

یہ کتابچہ استشراق (Orientalism) کے موضوع پر مختصر تعارف فراہم کرتا ہے۔ اس کا مقصد ان لوگوں کو موضوعِ استشراق پر بنیادی معلومات فراہم کرنا ہے جو اس پر مزید مطالعے کے لئے خود کو تیار کرنا چاہتے ہیں۔ یا گہرائیوں میں گئے بغیر صرف خلاصہ جاننا چاہتے ہیں۔ کتابچہ اپنے موضوع کے اعتبار سے نہایت قیمتی مندرجات پر مشتمل ہے۔ یہ نا صرف مستشرقین کی فکری اساس اور ذہنی نفسیات کو سمجھنے کے لیے انتہائی مدد و معاون ہے، بلکہ تاریخ کے مطالعے کے اصول بھی نہایت خوش اسلوبی سے واضح کرتا ہے۔

اس کے مصنف مولانا عبد القدوس ہاشمی ہیں جو ماضیِ قریب کے نامور عالم، مترجم و محقق رہے ہیں۔ مولانا نے دارالعلوم ندوۃ العلماء اور دیگر عظیم درسگاہوں سے شرف تعلیم حاصل کیا۔ انہیں اللہ سبحانہ و تعالی نے بے پناہ علمی وسعت عطا فرمائی تھی۔ اس کا ایک سبب دوران تعلیم علوم وفنون پر مشتمل انگریزی، اردو، سنسکرت، عربی اور ترکی زبان میں موجود ہزاروں کتابوں کا ان تھک مطالعہ تھا۔ یہ کتابچہ دراصل مولانا کے ایک فاضلانہ مقالے سے ماخوذ ہے جو کہ انہوں نے 30 ستمبر 1969ء کو راولپنڈی کے ایک اجتماع "شام ہمدرد" میں پڑھا تھا۔ بعد ازاں یہ مقالہ "مکتبہ ملی، کراچی" سے طباعت پذیر ہوا۔ اس کی اہمیت کے پیشِ نظر اسے مجلہ "الواقعۃ" میں بھی شائع کیا گیا۔ اب آسٹریلین اسلامک لائبریری اسے کتاب کی شکل میں جدید ایڈیٹنگ اور مختصر حواشی کے ساتھ شائع کرنے کا شرف حاصل کر رہی ہے۔

اس اشاعت کے حوالے سے ہمارے پیشِ نظر صرف اور صرف رضائے الٰہی کا حصول ہے۔ اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ اس کاوش کو شرفِ قبولیت بخشے اور اس عاجزانہ کوشش کے سبب ہمیں اپنے دین کی خدمت کے لئے چن لے۔ إِنَّ رَبَّنَا لَغَفُورٌ شَكُورٌ۔

آمین

محمد نبیل مشرف

چیئرمین، **آسٹریلین اسلامک لائبریری**

جون، 2017

حصہ اول: تاریخ کیا ہے اور تاریخ نویسی کا صحیح طریقہ کیا ہے

استشراق کا لفظ عموماان تحقیقات کے لئے استعمال ہوتا ہے جو غیر مسلم افراد و اقوام نے مشرقی اقوام بالعموم، اور اسلامی مذہب و اقوام بالخصوص، کے بارے میں معلومات حاصل کرنے یا اپنے مشاہدات و خیالات کو قلمبند کرنے کے لئے کیں۔

مستشرقین کے طریقۂ تحقیق میں چند نمایاں خصوصیات یہ رہی ہیں:

- اپنے قوم، مذہب و نظریات کو دوسری قوموں اور مذاہب سے بالاتر تصور کرنا۔
- دوسرے مذاہب اور ان کے ماننے والوں کو ایک 'جامد شے' سمجھ کر پڑھنا۔
- تحقیقی کام کو اصل تحقیقی مقاصد سے ہٹ کر مذہبی، سیاسی و معاشی مقاصد کے لئے استعمال کرنا۔
- پہلے سے نتیجہ ذہن میں رکھ کر تحقیق کو ایسے انداز میں پیش کرنا کے وہی نتیجہ نکالا جاسکے۔ مثلاایک دور میں مشرقی اور اسلامی تہذیب کو کسی خاص مقصد کے پیشِ نظر رنگینیت اور جنسی سرگرمیوں سے لبریز دکھانا، اور کسی دوسرے وقت کسی دوسرے مقصد کے حصول کے لئے اسی تہذیب اور زمانے کو ہر طرح کی رنگ ورونق سے خالی ثابت کرنے کی کوشش کرنا۔ اگر استعماری دور سے پہلے اور اس کے بعد کے استشراقی لٹریچر کو دیکھا جائے تو اسلام اور مسلمانوں کی دو بہت مختلف تصویریں دکھائی دیتی ہیں۔ اس کی وجہ وہ مختلف اغراض و مقاصد ہیں جو ان ادوار میں مستشرقین کے پیشِ نظر رہے اور جن کے حصول کے لئے انہوں نے علمی کوتاہیاں کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا۔

گو کہ مستشرقین کی زیادہ تر کاوشیں درج بالا خصوصیات کی حامل رہی ہیں، مختلف ادوار میں ایسے مستشرقین بھی رہے ہیں جو کہ قابلِ تحسین علمی سرگرمیں میں مصروف رہے۔ لیکن **استشراقی مصنفین و محققین میں سے صحیح اور غلط کو چھانٹ کر علیحدہ کرنا ایک نہایت مشکل کام ہے۔** اکثر صحیح نیت والے محققین بھی علمی کمزوریوں کے باعث فتیح غلطیاں کرتے نظر آتے ہیں۔

کتابچہ کے اس پہلے حصہ میں اصل بحث شروع کرنے سے قبل **تاریخ کی تعریف** بیان کی گئی ہے اور وضاحت کی گئی ہے کہ ایک مورخ کے پیشِ نظر کیا ملاحضات ہونے چاہیئیں۔ اس کے بعد ان ملاحضات کے پیشِ نظر نہ ہونے کی وجہ سے ہونے والی علمی غلطیوں کی کچھ مثالیں دے کر ان کی اہمیت واضح کی گئی ہے۔

یہ عالم حوادث و واقعات سے پُر ہے۔ ہر صبح کچھ نہ کچھ حوادث اپنے ساتھ لاتی ہے اور ہر روز کوئی نہ کوئی واقعہ ہوتا ہی رہتا ہے۔ ان ہی حوادث و واقعات کی ترتیب، ان کے اسباب و علل کی تلاش اور ان کے اثرات و نتائج کی نشاندہی کو تاریخ کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

علم تاریخ نام ہے فطرت کے قوانین تکوین یعنی سنة الله فی الارض کی شناخت اور اس کے بیان کا۔ ایک مورخ یہ بیان کرتا ہے کہ:

- کونسا واقعہ پیش آیا

- کب اور کہاں پیش آیا
- اس کے اسباب کیا تھے اور
- اس کے اثرات و نتائج کیا پیدا ہوئے۔

اس طرح جب ہم ماضی پر غور کرتے ہیں تو حسب ذیل سوالات ذہن میں خود بخود اُبھرتے ہیں:

1. کیا یہ واقعہ پیش آیا؟ اس سلسلے میں بیان کرنے والے کا ذریعہ علم، اس کے ثقہ یا غیر ثقہ ہونے کے متعلق معلومات۔ واقعہ کے امکانِ عقلی و امکان عادی کے متعلق تحقیق و تدقیق کی ضرورت پڑتی ہے۔ واقعہ کا ظرفِ مکان اور ظرفِ زمان متعین کرنے کا مرحلہ طے کرنا پڑتا ہے۔ تحقیقات کے بغیر یہ یقین نہیں پیدا ہو سکتا کہ واقعہ فی الحقیقۃً ہوا بھی یا نہیں۔
2. اس کے بعد یہ مرحلہ پیش آتا ہے کہ واقعہ کے اسباب کیا تھے اور اس کے اثرات کیا مرتب ہوئے۔ اس کی تلاش و تحقیق ایک بڑا کٹھن مرحلہ ہے۔ اگر کوئی محقق اس مرحلہ پر گھبرا کر سہل انگاری سے کام لیتا ہے تو تاریخ کی صحیح ترجمانی نہیں کرتا۔

ان دونوں قسموں کے سوالات کو حل کرنے کے بعد ہی کوئی بیان، تاریخ کا بیان ہو سکتا ہے ورنہ محض افسانہ بلکہ مجلسی لطیفے سے زیادہ اس بیان کی علمی قیمت نہیں قرار پا سکتی۔

مثلاً ایک مستشرق نزول وحی کے دن حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت ام المومنین بی بی خدیجہ کے مابین اس خلوت کی گفتگو کو نقل کرتا ہے۔ جہاں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ام المومنین کے سوا تیسرا آدمی موجود نہیں ہے اور حوالہ میں یہ لکھ دیتا ہے کہ "محمد بن اسحاق المتوفی سنہ ۱۵۱ھ نے یہ گفتگو اپنی کتاب میں لکھی ہے۔"

اس گفتگو کی صحت تسلیم کرنے کے سلسلہ میں تاریخ کے ایک طالب علم کے سامنے یہ سوالات آتے ہیں:

1. کیا خلوت میں کوئی تیسرا شخص موجود تھا؟ روایت کسی تیسرے شخص کی موجودگی سے قطعی انکار کرتی ہے۔
2. کیا یہ واقعہ حضرت ام المومنین نے کسی سے بیان کیا؟ حضرت ام المومنین سے کوئی روایت موجود نہیں ہے۔
3. کیا یہ واقعہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی صحابی سے بیان کیا؟ کوئی صحابی یہ نہیں بیان کرتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے مجھ سے یہ واقعہ بیان فرمایا۔

ظاہر ہے اب سارا دارومدار محمد بن اسحاق اور اس کے شیوخ پر رہ گیا۔ عملاً یہ ممکن نہیں کہ خلوت میں اس وقت کوئی شخص موجود ہو، پھر علم رجال یہ بھی وضاحت کے ساتھ ہمیں بتا دیتا ہے کہ محمد بن اسحاق اور اس کے اکثر شیوخ غیر محتاط قصہ گو اور کہانیاں بنانے والے تھے۔

امام ذہبی نے میزان الاعتدال ص ۲۲ ج ۳ طبع القاہرہ ۱۳۲۵ھ میں لکھا ہے:

" قال یحی القطان اشھد ان محمد بن اسحاق کذاب قال ابن معین وھو صالح الحدیث مالہ عندی ذنب الا ما قد حشا فی السیرۃ من الاشیاء المنکر ۃ المنقطعۃ و الاشعارا المکذوبۃ۔ قال مالک انظروا الی رجال من الدجاجلۃ دخل رجل معہ حمل فوضعہ فی عنق ابن اسحاق فاخرجہ نذھب الی السلطان فجلد۔ قال سعید من اجل القدس۔"

ذرا غور فرمایئے۔ واقعہ کا ظرفِ زمان وظرفِ مکان خلوت میں کسی راوی کے وجود کو عادۃً ناممکن قرار دیتا ہے خود روای غیر ثقہ، قصہ گو اور بے اعتبار اور بیان واقعہ "لفظ بہ لفظ" اس واقعہ کی تاریخی قیمت کیا قرار دی جائے ؟

اس جگہ ایک کم نظر کو یہ غلط فہمی ہو سکتی ہے کہ ایسی گفتگو ہونا امکانِ عقلی وعادی کے حدود میں تو آتا ہے اس لیے ہو سکتا ہے کہ ایسی گفتگو ہوتی ہو۔ لیکن ذرا غور فرمایئے تو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ غلط فہمی ہے اور فکر کی کمزوری سے پیدا ہوئی ہے۔ **کسی حادثہ کا صرف ممکن ہونا، اس کے حقیقتہً واقعہ ہونے کی دلیل نہیں ہو سکتا۔**

مثلاً کوئی شخص یہ بیان کرے کہ جس جگہ آج راولپنڈی کا ریلوے اسٹیشن ہے وہاں اس سے پہلے ایک مندر تھا۔ اسے توڑ کر انگریزوں نے ریل کا اسٹیشن بنادیا تو اگرچہ اس کا امکانِ عقلی وامکانِ عادی موجود ہے لیکن جب تک اس کی کوئی شہادت نہ مل جائے صرف امکان کی وجہ سے اسے واقعہ تاریخی نہیں سمجھا جا سکتا۔ اگر ایسا ہوا کرے کہ صرف امکانِ واقف کو دلیلِ واقعہ قرار دے دیا جائے تو ہر ناول وافسانہ تاریخ کا مرتبہ پا جائے گا اور تحقیق کا سارا دفتر خرافات کا پلندہ بن جائے گا۔ شہادت ملنے کے بعد بھی ایک مرحلہ شہادت کی قیمت مقرر کرنے کا باقی رہ جاتا ہے۔ ہر بیان، تاریخی قیمت نہیں رکھتا اور نہ ہر شہادت قابلِ اعتماد ہوتی ہے۔

ایک اور مثال تاریخی تنقیح سے غفلت کی سن لیجئے۔ اس کے بعد اصل، موضوع پر جو ایک مختصر سی گفتگو ہے اس کے سمجھنے میں آسانی ہو گی۔

مرحوم ڈاکٹر حسن ابرہیم حسن نے جو مصر کی سب سے بڑی یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر اور آکسفورڈ Oxford کے سند یافتہ ڈاکٹر تھے۔ اپنے ماہر فن اساتذہ کے حوالہ سے کتاب "مشاہیر اسلام" (ص 24) میں یہ لکھا ہے کہ ''حضرت عثمان ذی النورین نے حضرت ابو بکر صدیق کے سمجھانے سے اسلام قبول کیا اور اس وقت حضرت عثمان کی عمر 20 سال سے زیادہ نہ تھی۔" اسی کتاب کے صفحہ 23 پر وہ لکھ چکے ہیں کہ "حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت کے پانچ یا چھ سال بعد حضرت عثمان پیدا ہوئے۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جب پہلی وحی نازل ہوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سن مبارک چالیس سال یا اس سے کسی قدر زائد تھا۔ سوال یہ ہے کہ اس حساب سے حضرت عثمان کا سن 35 یا 34 سال ہونا چاہئیے۔ بیس سال کیسے ہو گا؟

اسی کتاب کے صفحہ 280 پر ہے کہ "حضرت عبداللہ بن زبیر کی عمر جب 17 سترہ برس کی ہوئی تو ان کے والد بزر گوران کو لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں بیعت کے لیے حاضر ہوئے۔"

حضرت عبداللہ بن زبیر سن 1 ہجری میں بمقام قبا پیدا ہوئے یہ خود اسی کتاب کے صفحہ (278) پر موجود ہے اور سارے مورخین کے نزدیک مسلم ہے۔ حساب کر کے دیکھئے کہ عبداللہ بن زبیر کی عمر کا گیارھواں سال شروع ہی ہوا تھا یا شاید دو دن ابھی دس سال کے پورے ہونے میں باقی تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وفات پا گئے۔ یہ کہاں ممکن ہے کہ عبداللہ بن زبیر نے 17 سال کی عمر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت کی ہو۔

روایاتِ تاریخ کی تنقیح اور اشخاص و اوقات کی تعین میں غفلت نے کیسی مضحکہ خیز غلطیاں سرزد کرادیں۔ ان دونوں روایتوں میں فاضل مورخ نے ایک عثمان کو دوسرے عثمان سے اور ایک عبداللہ بن زبیر کو دوسرے عبداللہ بن زبیر سے خلط ملط کر کے ناممکن کو ممکن بنادیا۔ شاید فاضل مصنف اور ان کے نامور اساتذہ نے علم الرجال کا مطالعہ نہیں کیا ورنہ اس طرح کی غلطی سرزد نہ ہوتی۔

یہ صرف دو مثالیں ہیں آپ تلاش کریں تو اور بہت سی مثالیں مل سکتی ہیں جن سے یہ ثابت ہو جاتا ہے **کہ ناقص مطالعہ کو کافی سمجھ کر لکھنے اور روایات کی تنقیح و تحقیق کے بغیر اس کو نقل کر دینے سے** کیسی عجیب عجیب قسم کی غلطیاں بڑے بڑے نامور حضرات سے بھی ہو جاتی ہیں۔

خدانخواستہ یہ مقصود نہیں ہے کہ کسی کے علم کی تقلیل یا اس کے کارناموں کی توہین کر کے اپنی بڑائی ثابت کی جائے۔ مقصود صرف یہ ہے کہ میرا یا کسی شخص کا بیان بغیر ضروری تنقیح کے قابل قبول نہیں ہوتا۔ یہ لازم ہے کہ اچھی طرح جانچ پڑتال کر لی جائے۔ اور یہ تو صرف ان غلطیوں کے بارے میں کہا جا رہا ہے جو اقتضائے بشری یا ناقص مطالعہ سے سرزد ہو جاتی ہیں۔ لیکن اگر محقق کی **نیت کا کھوٹ اور مقصد کی قباحت** بھی تحقیق و تحریر کے ساتھ مل جائے تو پھر اس کے کرشمے بہت عجیب اور حد درجہ گمراہ کن ہوتے ہیں اگر مقصد ہی یہ ہو کہ کسی مذہب کو یا کسی قوم کو حقیر اور ناقابل نفرت ثابت کیا جائے تو پھر اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد　　　جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

علامہ بروکلمان (Carl Brockelmann) مشہور جرمن مستشرق ہماری صدی کے سب سے بڑے مستشرق اور بلاشبہ عربی ادبیات کے بے مثال عالم ہیں انہوں نے عربی کتابوں کی ایک ایسی جامع اور معلومات افزا فہرست[1] تیار کی ہے کہ دوسری کوئی کتاب اس موضوع پر اس کے مقابلہ میں نہیں پیش کی جا سکتی۔ ابن الندیم کی "الفہرست"[2]، مصطفی طاش کبریٰ زادہ کی "مفتاح السعادة"[3]، حاجی خلیفہ کی "کشف الظنون"[4]، اسمٰعیل

---

[1] بروکلمان کی اس کتاب کا نام Geschichte der arabischen Litteratur (تاریخ الادب العربی) ہے جو کہ 1937 تک عربی زبان میں موجود تمام کتابوں کی فہرست ہے۔ یہ کتاب علومِ اسلامیہ کے طلاب کے لئے نہایت اہمیت کی حامل سمجھی جاتی ہے۔

[2] یہ محمد بن اسحٰق بن ابن یعقوب الندیم (987ھ) کی مرتب کردہ ضخیم کتاب ہے جس میں ان تصانیف کے متعلق معلومات درج کی گئی ہیں جو بغداد میں تاتاری حملے کے وقت ضائع ہو گئیں تھیں۔ پیشے کے لحاظ سے ابن ندیم کتب فروش تھے اور اس کے ساتھ ساتھ بغداد میں کتابوں کی نقل تیار کرنے کا بھی کام سر انجام دیتے تھے۔ ان کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ ان کا تعلق شیعہ مسلک سے تھا۔ الفہرست اپنی ترتیب کے وقت اور اپنے مواد کے لحاظ سے یہ نہایت نادر کتاب ہے۔ یہ اپنے موضوع پر اصل الاصول کی حیثیت رکھتی ہے۔ ابن ندیم بیان کرتے ہیں کہ اس فہرست میں انہوں نے عرب اور غیر عرب دونوں ہی کی لکھی ہوئی عربی کتب شامل کی ہیں۔۔ مناسب حجم کی اس کتاب میں عربی کی تمام اصل مؤلفات اور دیگر زبانوں سے کیئے گئے تراجم کا استقصاء کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ کتاب اسلام کی پہلی چار صدیوں میں علوم و ثقافت کی ترقی کا جائزہ لینے کے لئے اولین اور مستند ماخذ مانی جاتی ہے۔ زیادہ تر کتابوں کے ساتھ مصنفین کے حالات زندگی بھی تحریر کیے گئے ہیں کتب کو دس ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے جس میں دینی و دنیاوی دونوں طرح کے علوم موجود ہیں۔

پاشاکی "ایضاح المکنون" اور "هدية العارفين"[5] اور یوسف الیان سرکیس کی "معجم المطبوعات"[6] سے بھی علامہ بروکلمان کی تاریخ ادبیات عرب کا مرتبہ بعض اعتبار سے بلند ہے۔ آج کسی ایسے کتب خانہ مشرقیات کا تصور بھی ممکن نہیں جس میں علامہ بروکلمان کی یہ بے بہا کتاب موجود نہ ہو۔

لیکن یہی علامہ بروکلمان جب ایک پکے عیسائی بن کر اور یورپین اقوام کو ترجیحی مزایا و مناقب کے جذبات کو اپنے سینے میں لے کر "تاریخ مسلمانان عالم" لکھتے ہیں تو ایسی بے سروپا باتیں لکھتے چلے جاتے ہیں کہ بہت سی مملکتوں کو ان کی کتاب کا داخلہ اپنے ممالک میں بند کر دینا پڑا۔ چنانچہ پاکستان میں بھی اس کتاب کا داخلہ بند ہے۔ میں نے یہ کتاب پڑھی ہے۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ عربی کتابوں کا یہ عظیم المرتبت کتاب شناس، کتابوں کا نام بتاتا ہے۔ مصنف کا نام اور اس کا سن وفات بتاتا ہے، کتاب کس کس کتب خانہ میں اور کہاں کہاں موجود ہے یہ بھی بتادیتا ہے کبھی کتابوں کو کھول کر پڑھتا کیوں نہیں۔ اول تو کتابیں پڑھیں بہت تھوڑی، جو پڑھیں ان کی روایات پر غور نہیں کیا، پھر اسباب و نتائج ایسے پیدا کر لیے کہ کسی شخص کے حاشیۂ خیال میں ایسے عجیب و غریب اسباب و نتائج نہیں آ سکتے آخر ایسا کیوں ہوا؟ اس کا جواب اس کے سوا کچھ نہیں کہ تاریخ لکھتے ہوئے ان کا ذہن ایک متعصب کا ذہن تھا اور ان کے قلب و دماغ پر یورپین اقوام کی برتری کے تصورات کا قبضہ تھا۔

میں اس جگہ کچھ اقتباسات اس کتاب سے پیش کرتا۔ لیکن چونکہ اس کا اقتباس کرنا بھی قانوناً ممنوع ہے اس لیے صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ پوری کتاب دور دراز کار قیاسات اور بے سروپا باتوں سے بھری پڑی ہے۔

---

[3] یہ کتاب احمد بن مصطفیٰ بن خلیل زادہ کی تصنیف کردہ ہے جو کہ طاش کبری زادہ کے نام سے بھی جانے جاتے ہیں۔ یہ خلافتِ عثمانیہ کے دور کے مشہور مورخ سمجھے جاتے ہیں اور حنفی مسلک سے تعلق رکھتے تھے۔ کتاب مفتاح السعادۃ میں طاش کبری زادہ نے معاصر عہد کے جملہ متداول علوم کا تعارف پیش کیا ہے، اس لحاظ سے یہ کتاب عثمانی دور خلافت میں رائج جملہ علوم کا موسوعہ اور ہمیشہ سے متعلقہ موضوعات پر محققین کا مرجع رہی ہے۔ اس میں شامل اہم موضوعات میں تعلیم و تعلم، شرعی علوم، اور فہارست (علوم، اسماء کتب، شخصیات و مصنفین اور اماکن) شامل ہیں۔ کتاب تین جلدوں، چار مقدمات اور سات دوحوں پر مشتمل ہے۔

[4] کتاب کشف الظنون کے مصنف مصطفیٰ بن عبداللہ ہیں جو کہ حاجی خلیفہ کے نام سے بھی جانے جاتے ہیں۔ یہ سترہویں صدی میں عثمانی دور کے مورخ، جغرافیہ داں گزرے ہیں۔ مشہور مورخ فرانز بابنگر ان کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ سب سے عظیم عثمانی مورخ تھے اور ان کا علم ان تمام علوم کا احاطہ کرتا تھا جو کہ ایک انسان تصور کر سکتا تھا۔ سیاسی مشکلات کی شکار عثمانی خلافت کو ایک نئی جہت فراہم عطا کرنے میں انہوں نے نہایت اہم کردار ادا کیا اور ان کا سائنس سے وہ رشتہ جو تیرہویں صدی میں ٹوٹ گیا تھا، دوبارہ استوار کیا۔ انہوں نے یورپ کے سامراجی عزائم کی طرف نشاندہی کی اور واضح کیا کہ کس طرح سائنسی دریافتوں کے ذریعے وہ آہستہ آہستہ دنیا کے مختلف حصوں پر اپنے پنجے مظبوطی سے جما رہے تھے اور ان سے مقابلے کے لئے مسلمانوں کو کن امور کی طرف توجہ دینا ناگزیر تھی۔ اسی بناپر انہوں نے علمِ جغرافیہ کو امراء سلطنت کے لئے لازم قرار دیا۔ اس علم کے بغیر وہ سامراجی ایجنڈہ کو سمجھنے کے قابل کبھی نہیں ہو سکتے تھے۔ انہوں نے آنے والے وقتوں میں سائنس کی اہمیت کو ہر ممکن طور پر اجاگر کیا۔ کتاب کشف الظنون کا پورا نام "كشف الظنون عن أسامي الكتب والفنون" ہے جس کا مدعا کتابوں اور فنون کے ناموں کے حوالے سے وضاحت ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے چودہ ہزار اور پانچ سو کتب کی تفاصیل بترتیب حروفِ تہجی پیش کی ہیں۔

[5] 'ایضاح المكنون في الذَّيل على كشف الظُّنُون' اور 'هدية العارفين وأسماء المؤلفين وآثار المصنفين' کے مولف إسماعیل پاشا البغدادی ہیں جو ماضی قریب میں مشہور ادیب، اور کتب شناس گزرے ہیں۔ یہ کتب ایک طرح سے کشف الظنون ہی کا تسلسل ہیں۔

[6] یہ کتاب 1919ء تک لکھی گئی یا ترجمہ کی گئی کتب کی فہرست فراہم کرتی ہے۔ مولفین کے نام بھی کتب کے ساتھ درج کئے گئے ہیں۔

حصہ دوم: استشراق کی ابتدا اور استشراقی فکر کی مختلف صورتیں

اس حصے کا آغاز اسلام کے خلاف ہونے والی ان سازشوں کی تفصیل سے ہوتا ہے جو دورِ نبوت اور دورِ خلفاء راشدین کے یہود و نصاریٰ سرانجام دیتے رہے۔ اس وقت مسلمانوں کے بلند اخلاق اور ان سازشیوں کے رزیل اخلاق کی وجہ سے ناکامی ان کا مقدر ہوئی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دوسری اقوام کو مسلمانوں کو مزید قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور ان کی سازشوں نے بھی نیا رخ اختیار کر لیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ رخ بھی بدلتا گیا۔ مستشرقین کا اولین مقصود اسلام اور پیغمبرِ اسلام کے خلاف شکوک و شبہات پھیلانا رہا۔ ہر دور کے کم علم افراد اس طرح کے شکوک و شبہات کا نشانہ بنتے رہے۔ لیکن جیسے جیسے عربی کتب کے ترجمے عام ہوتے گئے (جس کے لئے مستشرقین نے اپنا بہت سا وقت اور سرمایہ لگایا)، بہت سے شکوک و شبہات دم توڑتے گئے اور خود مستشرقین ہی میں سے بعد میں آنے والوں نے پہلے والوں کی سازشوں کا پردہ چاک کر دیا۔ لیکن بعد والوں نے بھی اپنے اندازِ فکر کی وجہ سے کچھ مزید شکوک کو جنم دیا اور اپنے مقصد میں پہلوں سے کچھ بہت مختلف نہیں ثابت ہوئے۔ مصنف نے مثالوں کے ذریعے اس موقف کی وضاحت کی ہے۔

استشراق کی ابتداء

یہودیوں اور عیسایوں کا واسطہ مسلمانوں سے بالکل ابتدائی دور میں ہو گیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی حیات طیبہ کے مکی دور ہی میں یہودی اور عیسائی دین اسلام پر اعتراضات کی ابتداء کر چکے تھے اور مخالفت کرنے میں قریش کے بت پرستوں کے ہمنوا تھے۔ مدینہ منورہ کے گیارہ سالہ دور میں یہ مخالفت اور زیادہ شدت اختیار کر گئی۔ خصوصاً یہودیوں کی مخالفت اور طرح طرح کی ریشہ دوانیوں کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ قرآن حکیم کے وحی الٰہی ہونے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے نبی صادق ہونے کے خلاف طرح طرح کے اعتراضات ان کی طرف سے ہوتے رہے قرآن مجید کی مکی اور مدنی آیتوں میں ان کے بعض اعتراضات اور جوابات کا ذکر موجود ہے۔ آں حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی وفات کے بعد خلافتِ صدیقی و فاروقی میں ان لوگوں سے مسلمانوں کو ہر جگہ واسطہ پڑا اور عراق و شام کی فتوحات نے تو آپس میں ایک دوسرے سے ملنے کی راہیں پوری طرح کھول دیں۔

عیسائی علمائے مذہب نے اس زمانہ سے بطور مہم کے اسلام اور اس کی تعلیمات سے واقفیت پیدا کرنے اور قرآن مجید اور سیرت رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے متعلق طرح طرح کے شبہات پیدا کرنے کی ابتداء کر دی تھی۔ مگر اس زمانہ میں ان کی طرف سے خود عیسائی بھی کچھ زیادہ توجہ نہیں کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بازنطینی حکومت کی سخت گیری کے مقابلہ میں مسلمانوں کی رواداری اور آزادی نے مفتوحہ علاقوں کی غیر مسلم آبادی کے لیے ایسی صورتحال پیدا کر دی تھی کہ لوگ مسلمان فاتحین کی آمد کو خدا کی رحمت سے تعبیر کرتے تھے اور اپنے متعصب مذہبی پیشوائوں کی طرف لوگ کم ہی توجہ کرتے تھے۔ اس زمانہ میں لوگ جوق در جوق مسلمان ہوتے جاتے تھے۔ مصر و شام کے عیسائی اور یہودی علماء اور پیشوایان مذاہب اس کے مقابلہ میں بے دست و پا سے ہو گئے تھے۔

ولید بن عبدالملک (86-96ھ) کے دور میں کاشغر، بخارااور سندھ فتح ہو گیااور اس زمانہ میں اندلس بھی ممالک اسلامیہ میں شامل ہوا۔ اب اہل یورپ سے مسلمانوں کا براہ راست تعلق قائم ہو گیا۔ اگرچہ اس سے پہلے بھی یورپ کے زائرین بڑی تعداد میں بیت المقدس میں کنسیئہ قیامت اور ولادت گاہ مسیح کی زیارت کے لیے جاتے تھے، بلکہ بہت سے یورپین طلباءبیت المقدس اور دمشق میں رہ کر علم حاصل کرتے تھے مگر ان کا تعلق اتنا گہرااور ایسادوامی نہ ہوتاتھاجیساکہ اندلس کی فتح کے بعد سے ہو گیا۔

تفصیلات کے بیان کا یہ موقع نہیں، عرض یہ ہے کہ یورپ کے طالبان علم کا تعلق اور عیسائی ویہودی پیشوایان مذہب کی اسلام کے خلاف علمِ فلسفہ اور تحقیقات کے نام سے مساعی بالکل ابتدائی دور اسلامی ہی سے جاری تھیں اور آج تک جاری ہیں۔اس لیے ہم تاریخ کے کسی خاص وقت کو اس جدو جہد کا نقطہ آغاز قرار نہیں دے سکتے۔ **البتہ تاریخ کے مختلف ادوار میں اس کے طریقے بدلتے رہے۔**

وقت کے ساتھ ساتھ مستشرقین کے طریقہ کار میں تبدیلی

مقاصد میں اگرچہ کوئی بنیادی تبدیلی نہیں ہوئی لیکن کلیسا کا زور ٹوٹنے کے بعد سے کچھ ایسے مستشرقین ضرور پیدا ہوئے جنھوں نے جرات کے ساتھ اپنے ہی اساتذہ کی پھیلائی ہوئی بہت سی باتوں کو غلط قرار دیااور پوری قوت کے ساتھ ان کی تردید کی۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ اس تردید سے ان کا مقصد سچ کو سچ کرکے دکھانا تھایاخود اپنی طرف سے پیدا کیے ہوئے شکوک کو قابل قبول قرار دینا تھا۔اس لیے کہ ان کی تردید کرنے والوں میں سے اکثر نے جہاں اپنے پیش رو مستشرقین کے کذب وافتراء کی پوری قوت کے ساتھ تردید فرمائی ہے وہاں اپنی طرف سے کچھ نہ کچھ نئے شبہات بھی پیدا کر دیے ہیں اور اتنی معصومیت کے ساتھ دبی زبان میں کوئی نہ کوئی نئی بات کہہ گئے ہیں کہ پڑھنے والوں کو ان کی نیت پر کوئی شبہ بھی پیدا نہ ہو سکے۔

مثلاًلندن یونیورسٹی کے مشہور پروفیسر علامہ ڈینس سورااپنی کتاب "تاریخ الادیان" میں قرآن مجید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق بے سروپااعتراضات اور اپنے ماقبل کے مستشرقین کی پھیلائی ہوئی جھوٹی باتوں کی پوری قوت کے ساتھ تردید کرتے ہیں۔ یہ کتاب 1933ء میں لندن سے شائع ہوئی ہے وہ اپنے بیان میں اس قدر غیر متعصب اور بے لاگ مصنف نظر آتے ہیں کہ کسی کو ان کی نیت پر شُبہ کرنے کی گنجائش نظر نہیں آتی، بلکہ وہ اچھے خاصے عقیدت مند کی طرح بیان کرتے ہیں کہ

> "مذاہب کے عظیم بانیوں میں سے شاید محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک ہی شخص ہیں جن کی شخصیت سے تاریخی حیثیت سے بالکل واضح ہے اور خرافات نے ان کی شخصیت پر کوئی پردہ خفا نہیں ڈالا ہے۔"

اور اس کے بعد عقید تمندانہ انداز میں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کارناموں کی تعریف کرتے ہیں بلکہ خراج عقیدت پیش کرتے ہیں لیکن اس کے بعد یہ بھی کہتے ہیں کہ

"بلاشبہ عرب کے لوگ جنوں اور روحوں کی پوجا کرتے تھے اور روحوں کے حجری مجسموں میں جا گزیں ہونے کے قائل تھے۔ان کے علاوہ قبیلہ قبیلہ کے الگ الگ بت بھی ہوتے تھے۔اسلام نے ان سب بتوں کو نیست نابود کر دیا۔ صرف ایک حجر اسود کو باقی رکھا شاید اس لیے کہ اس سے حضرت ابراہیم خلیل اللہ کا احترام مقصود تھا یا شاید یہ ایک سیاسی عمل تھا جس کے ذریعہ عربوں کے باہمی اتفاق کو باقی رکھنا مقصود رہا ہو"۔(ص 221 المشرقون والاسلام مصنفہ زکریا ہاشم زکریا۔ طبع القاہرہ 1965ء)

آپ نے دیکھا کہ فاضل پروفیسر نے کس معصومیت کے ساتھ یہ یقین دلانے کی سعی فرمائی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سیاسی مصلحت کی بناء پر ایک بت کو باقی رکھا اور اس حد تک بت پرستی کو اسلام میں جائز قرار دیا۔ حالانکہ زمانہ جاہلیت میں بھی جبکہ سینکڑوں بت تھے کبھی حجر اسود کو بتوں کے زمرہ میں نہیں شمار کیا گیا اور نہ کبھی اس کی پوجا کی گئی۔ حجر اسود کا ذکر ہی کیا۔اٹھارہویں صدی تک یورپ کے مستشرق اور محققین یہ لکھتے رہے اور مشہور کرتے رہے کہ مسلمان جو حج کو جاتے ہیں وہ اس لیے جاتے ہیں کہ خانہ کعبہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا ایک بُرنجی بت بنوا کر رکھ دیا ہے۔ مسلمان اس بت کو سجدہ کرنے کے لیے جاتے ہیں۔اٹھارہویں صدی کے آواخر اور انیسویں صدی کے اوائل میں خود علمائے یورپ نے اس کی تردید کی اور ایک بار نہیں بار بار مختلف ممالک کے علماء نے اس کی تردید کی۔تب یہ خیال لوگوں کے دلوں سے محو ہو سکا یا شاید اب بھی دور افتادہ دیہاتیوں میں یہ خیال موجود ہو۔

بہر حال جیسے جیسے علم کی روشنی پھیلتی گئی۔ عربی کتابیں یورپ کی مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو کر شائع ہوتی رہیں اور یہ انتہائی حق ناشناسی ہو گی کہ عربی کتب کے اصل مضمون کی تصحیح واشاعت اور ان میں سے بہت سی کتابوں کے یورپین زبانوں میں ترجمہ کرنے کی جو عظیم الشان خدمت پچھلے پانچ سو سال کے اندر یورپ کے مستشرقین نے انجام دی ہے اس سے انکار کیا جائے یا ان کو کمتر درجہ کا کارنامہ قرار دیا جائے۔اس کے لیے سینکڑوں مستشرقین نے اپنی عمریں صرف کر دیں حکومتوں اور بادشاہوں نے لاکھوں روپے خرچ کیے دولت مندوں نے بڑے بڑے اوقاف قائم کیے اور آج عربی کی بڑی بڑی اہم کتابیں جو ہمارے ہاتھوں میں ہیں ان میں سے بہت سی کتابیں وہی ہیں جو ان ہی مستشرقین کی مساعی جمیلہ سے پہلی بار طبع ہو کر ہمارے ہاتھوں میں آسکیں ہیں۔اس طرح افتراء پردازی کا وہ بادل بھی آہستہ آہستہ چھٹ رہا ہے جو صدیوں تک قدیم مستشرقین اور پیشوایانِ مذاہب کے بیانات اور ان کی تحریروں سے یورپین ذہنوں پر چھایا ہوا تھا، اب تحریروں کے انداز اور مستشرقین کے تحقیقات اسلامی کا طریقہ کسی نہ کسی قدر بدلا ہوا نظر آتا ہے، اگرچہ اب بھی مقاصد میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں دکھائی دیتی ہے۔ پادری زویر کی تحقیقاتِ اسلامی اور ڈاکٹر کنیٹوئیل اسمتھ کی تحقیقات میں مقاصد کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ملتا۔ دونوں کی تحقیقات کو دیکھ لیجئے۔ مقصد وہی استعماریت کی تائید اور مسلمانوں کے خلاف نفرت پھیلانے کی سعی ہے۔

حصہ سوم: استشراق کے چار ادوار اور ان کی خصوصیات

اس حصہ میں استشراق کی تاریخ کو چار ادوار میں تقسیم کر کے ہر دور میں ہونے والی استشراقی کاوشوں کی وضاحت کی گئی ہے۔ ہر دور میں اہم شخصیات کے نام اور مختصر احوال بھیدرج کئے گئے ہیں۔اس حصے کے مطالعے کے دوران اس دور کے سیاسی حالات سے واقفیت اہم کردار ادا کرتی ہےاور ہم تک پہنچنے والے استشراقی مواد کی قسم کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔

مستشرقین یورپ کی اسلامی تحقیقات کو ہم سہولتِ مطالعہ کے لیے چار ادوار میں تقسیم کرتے ہیں:

1. پہلا دور: ابتدائے تاریخ اسلامی یعنی ساتویں صدی مسیحی یا گریگوری سے لے کر پندرہویں صدی مسیحی یعنی بیداری یورپ تک۔
2. دوسرا دور: پندرہویں صدی کی ابتداء سے اٹھارہویں صدی کے اختتام تک۔
3. تیسرا دور: انیسویں صدی کی ابتداء سے بیسویں صدی کی پہلی چوتھائی کے ختم یعنی 1925ء تک۔
4. چوتھا دور: 1926ء سے آج تک۔

پہلا دور:

دورِاول میں یورپ کی حیثیت شاگردوں کی سی ہےاور مسلمانوں کی حیثیت استادوں کی سی۔ یہ دور تقریباً آٹھ سو سال کے طویل زمانہ پر مشتمل ہے۔ اس دور میں مسلمان اندلس میں، صقلیہ میں اور جنوبی اٹالیہ میں حاکمانہ حیثیت رکھتے تھے ان کے بڑے بڑے علماءاور فلسفی ان علاقوں میں موجود تھے۔اس وقت علم اور تمدن کے ممالک مسلمان تھے۔ان ہی کی تہذیب، تہذیب تھی اور ان ہی کے علوم، علم شمار کیے جاتے تھے۔

اس دور میں عیسائیوں اور خصوصاً یورپ کی ساری علمی زندگی پر ارباب کلیسا کا قبضہ تھا۔ پاپائے اعظم اور ان کے نائبین مسلمانوں سے مختلف علوم حاصل کرنے کی سعی کرتے تھے اور عربی کتب و رسائل جمع کرتے تھے اسلامی قوانین کا تھوڑا بہت مطالعہ اس دور کے آخری حصہ میں کیا گیا۔ طب، فلسفہ، فلکیات، زراعت اور قانون پر مسلمانوں کی تصانیف کا ترجمہ لاطینی اور فرنچ زبانوں میں ہوا۔ابن رشد اور جابر بن اسحاق اور ابن سینا کی کتابوں کے ترجمے کیے گئے۔ یہ کام عموماً اٹالیہ میں اور کسی قدر فرانس میں ہوا لیکن نیابت و دانائی کے ساتھ، فارابی کو "فاربس"، ابن رشد کو "ایوی روس"، جابر کو "جبیر" اور ابن سینا کو "اوی سینا" بنادیا گیا[7]۔اور طلباء کو یہ کبھی نہیں بتایا گیا، کہ یہ لوگ یورپین عیسائی نہیں بلکہ مسلمان تھے۔ اگر چہ یہ راز زمانہ مابعد میں راز نہ رہ سکا لیکن یورپ کے کچھ نہ کچھ لوگ اب بھی یہی سمجھتے ہیں کہ یہ لوگ یورپین تھے اور مذہباً عیسائی تھے۔

[7] ناموں کو لاطینی انداز میں پیش کرنے کے عمل کو Latinization کہا جاتا ہے۔ اس عمل کو کرنے والوں کے مطمعِ نظر مختلف مقاصد ہوتے ہیں، کچھ تو ان میں سے ناگزیر ہوتے ہیں، اور کچھ نہایت نامناسب۔ افسوس اس امر کا ہے کہ بہت سے مسلم دانشوروں اور سائینسدانوں کے ناموں کے نہایت نامناسب انداز میں لاطینی رنگ دیا گیا۔ ان میں سے اکثر نام تو اس طرح بدلے گئے کہ ان میں اصل نام سے کچھ بھی مماثلت نہ رہی۔ مثلا بنو موسی بھائیوں کو، جن کو عربی میں بنو موسی ابن شاکر المنجم کہا جاتا تھا، لاطینی میں Trium fratum کے نام سے لکھا گیا۔ اسی طرح الجزجانی ابو

اس دور میں مسلمانوں اور دین اسلامی سے متعلق بڑے عجیب عجیب ہیبت ناک قصے ارباب کلیسا کی طرف سے پھیلائے گئے۔ کچھ مسلمانوں کی سفاکی کے قصے اور کچھ قرآن مجید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلیہ وسلم کے متعلق بے سروپاافسانے خوب خوب گھڑے گئے اور اسی زمانہ میں یورپ والوں کو یہ باور کرایا گیا کہ مسلمان مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلیہ وسلم کے برنجی بت کو سجدہ کرنے کے لیے جایا کرتے ہیں۔

اس زمانہ کے اجلائے مستشرقین میں سب سے اول نام "جوبروی اور لیاک" ایک فرانسیسی راہب کا ملتاہے۔ یہ فرانس میں 938ء میں پیدا ہوا اور 1003ء میں بمقام وٹیکین وفات پائی۔ اس نے اندلس کے مدارس میں برسوں رہ کر تعلیم حاصل کی اور اپنی قابلیت کی وجہ سے واپس آکر فرانس و ایطالیہ میں بڑانام پیدا کیا۔ واپسی پر وہ ایطالیہ میں مستقل اقامت گزیں رہا حتیٰ کہ 999ء میں وہ بابائے اعظم کے جلیل القدر عہدہ پر منتخب ہو گیا۔ اس نے دو عربی مدرسے بھی قائم کیے اور فلکیات وریاضیات کی بعض کتابوں کے عربی سے ترجمے بھی کیے۔ اس کے تراجم و تصانیف کا مجموعہ 1899ء میں برلن سے شائع ہوا ہے۔ (نجیب الحقیقی۔ المستشرقون: ج1 ص120 طبع مصر 1964ء)

اس دور کے مستشرقین "اور لیاک" کے علاوہ قسطنطین الافریقی[8] المتوفی 1078ء، اوجودی سانتا، ڈی کویل، ایڈیلارڈ[9]، پطرس، یوحنارابرٹ، ہرمان[10]، ڈنیل مورلے[11]، میکل اسکاٹ[12]، لیونارڈ، تھامس ڈی اکوین[13]، روجر بیکن[14] اور رینڈلیو وغیرہ کے نام ملتے ہیں۔ یہ سب اندلس، صقلیہ

عبید عبدالواحد بن محمد کو Sorsanus کہا گیا۔ یحیٰ بن سرابیون Serapion یا Serapionis کو پکارا گیا۔ ماشاءاللہ ابن آثاری البصری کو Messahalla یا Messala کے نام سے منسوب کیا گیا۔ اسی طرح اس طرح کی بہت سی اور مثالیں دی جاسکتی ہیں اس امر کے مزید شواہد فراہم کرتی ہیں۔

[8] قسطنطین الافریقی (م1098ء-Constantine the African) کی زندگی کا اولین حصہ افریقہ میں اور باقی ایطالیہ (Italy) میں گزرا۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ ایک مرتد تھا جو عیسائی ہوا اور افریقہ چھوڑ کر ایطالیہ میں بس گیا۔ کچھ تاریخ دانوں نے یہ امر واضح کیا ہے کہ اس زمانے میں اکثر مسلمان بزور مذہب تبدیل کرنے پر مجبور کئے جاتے تھے (مثلا حسان الاوزان وغیرہ) اور قسطنطین کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہو سکتا ہے۔ واللہ عالم۔ پیشے کے لحاظ سے اس کا تعلق طب سے تھا اور تعلیم اس نے زیتونیہ کے مدارس اور مسلمان سائینسدانوں کی صحبت میں حاصل کی۔ ان مسلمان سائینسدانوں کے دروازے خاص و عام کے لئے ہر وقت کھلے رہتے تھے۔ اس نے اپنی زندگی کے آخری دس سال کلیسا کی نظر کئے اور بہت سی نایاب کتب کا عربی سے لاطینی (Latin) زبان میں ترجمہ کیا۔ ان میں زیادہ تر کتب طب سے متعلقہ تھیں۔ اس نے ایطالیہ کے اپنے پہلے سفر میں، جو کہ اس نے بطور تاجر کیا، یہ جانچ لیا کہ طب کے حوالے سے وہاں کے لوگوں کا علم نہایت سرسری تھا۔ اس سفر کے بعد یہ دوبارہ افریقہ آیا اور تین سال تک کتب کا ذخیرہ جمع کرتا رہا۔ اس کے بعد اس نے ایطالیہ کی طرف اپنا دوسرا سفر کیا اور طب میں اپنا نام پیدا کرنے کے لئے ترجمہ کا سلسلہ شروع کیا۔ ان کتابوں کے لکھنے والوں میں الرازی، ابن عمران، ابن سلیمان، ابن الجزاز اور دوسرے مسلمان سائنسدان شامل ہیں۔ یہ کتابیں بارہویں صدی سے سترہویں صدی تک یورپین یونیورسٹیوں میں بطور ٹیکسٹ بکس پڑھائی جاتی رہیں اور یورپ کے علمی عروج کا باعث بنیں۔ ان کے نسخے آج بھی ایطالیہ، جرمنی، فرانس، بیلجیئم اور انگلستان کے کتب خانوں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

[9] ایڈیلارڈ (م1152ء-Adelard of Bath; Latin: Adelardus Bathensis) ایک فلسفی تھا اور اس کا سب سے بڑا کارنامہ عربی-ہندی نظمِ اعداد کا یورپ میں تعارف کروانا تھا۔ اعداد کے اس سسٹم نے ان کی سائینسی ترقی کی بنیاد رکھی۔ اس سے پہلے استعمال ہونے والا رومن سسٹم بڑے اعداد وشمار کے لئے موزوں نہ تھا اور اسی وجہ سے سائینسی تحقیق میں رکاوٹ تھا۔ ریاضی کے علاوہ اور بھی بہت سے علوم کی کتابوں کا ترجمہ کرنے میں ایڈیلارڈ پیش پیش رہا۔

[10] ہرمان (م1160ء -Herman of Carinthia) کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے فلکیات کی کتابیں عربی سے لاطینی زبان میں ترجمہ کرنے میں سب سے بڑا کردار ادا کیا اور یہ ان ترجموں کی بدولت تھا کہ یورپ میں علمِ فلکیات کی معرفت عام ہوئی۔

[11] ڈنیل مورلے (م1210ء-Daniel of Morley) نے پہلے آکسفورڈ اور پھر پیرس یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی۔ لیکن وہاں اپنی پسند کے مطابق علمی معیار نہ پا کر یہ اسپین میں تولیدو (Toledo) چلا گیا جہاں جاکر اس نے عرب فلسفہ کا مطالعہ کیا۔ یہاں سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد یہ اپنی مادری سرزمین انگلستان واپس چلا گیا اور وہاں سائنس کے بارے میں کم فہمی پر نہایت افسردہ ہوا۔ اسی افسردگی کے باعث اس نے دوبارہ کسی اور زمین کی طرف سفر کا ارادہ کیا لیکن آکسفورڈ کے ایک پادری کے کہنے پر یہ ارادہ ترک کردیا اور وہیں اپنی خدمات پیش کیں۔ عرب فلاسفہ کے حوالہ جات ڈنیل کی کتابوں میں بکثرت ملتے ہیں۔ ڈنیل اور ایڈیلارڈ انگلستان کو اندھیرے سے نکالنے والوں کے ناموں میں سرفہرست آتے ہیں اور ان دونوں ہی کی علمی کاوشیں عرب علماء کی مرہونِ منت تھیں۔

اور دیگر اسلامی ممالک کی درسگاہوں میں تعلیم حاصل کرتے رہے ہیں اور بہت سی عربی کتابوں کے فرنچ اور لاطینی میں ترجمے کیے ہیں۔ تقریبا یہ سب راہب یا کلیسا کے خدام ہیں۔

اسی دور کا ایک بڑا فاضل اے تورمیدا بھی ہے جس نے ایطالیہ (Italy) میں تعلیم حاصل کی۔ بہت دنوں تک عیسائی خانقاہ کا مرشد اعلیٰ رہا۔ اس کے بعد تیونس چلا گیا۔ وہاں صدق دل سے مسلمان ہو گیا اور عبداللہ کے نام سے مشہور ہوا۔ وہیں تقریبا اسی سال کی عمر میں 32ء میں وفات پائی۔ اس کی قبر تیونس میں باب المنارہ میں ہے۔ (حوالہ سابق ص 132)

شیخ عبداللہ تورمیدا کے علاوہ اور بہت سے اطالوی اور فرنچ مستشرقین نے مطالعہ کے ذریعہ دین حق کو پالیا اور مسلمان ہو گئے۔ ان میں سے بعض نے اسلام پر لاطینی اور فرنچ میں کچھ رسالے بھی لکھے تھے۔ خدا جانے کہیں یہ رسالے اب کہیں موجود ہیں یا ضائع کر دیئے گئے۔

تاریخِ استشراق کے اسی دور میں یورپ کی پہلی بیداری یعنی Renaissance of the 12th century وقوع پزیر ہوئی جس کے ذریعے معاشرتی، سیاسی، معاشی اور فکری تبدیلیاں رونما ہونا شروع ہوئیں اور فلسفہ و سائنس کی بنیاد پر مغربی یورپ نے اپنے نئے سفر کا آغاز کیا۔ مورخین نے اسی بیداری کی لہر کو پندرہویں صدی میں رونما ہونے والی ایطالوی بیداری (Italian Renaissance) اور سترہویں صدی میں رونما ہونے والی سائینسی بیداری کا موجب و پیش خیمہ قرار دیا ہے۔

اس کے برعکس اسلامی تاریخ اس دور میں اپنے مشکل ترین وقت سے گزر رہی تھی۔ اسی دور میں خلافتِ عباسیہ کا زوال وقوع پزیر ہوا جس سے مسلمانوں کو شدید نقصان پہنچا۔ منگولوں نے مسلم ریاست و حکومت کو تہس نہس کر دیا۔ کتب خانے نیست و نابود کر دئے گئے۔ دار الحکمہ زمیں بوس کر دیا گیا۔ بہت سی ریاستیں اسلامی حکومت کے دائرہ اختیار سے نکل گئیں۔ اور اس سب کے ساتھ ہمارے دینی علوم میں گمراہ فرقوں نے پورے زور سے ملاوٹ شروع کر دی۔

یہ بات نہایت قابلِ غور ہے کہ بارہویں صدی کی بیداری اور اس کے بعد آنے والی بیداریوں میں ترجمہ کی تحریکوں نے ناقابلِ فراموش کردار ادا کیا۔ یہ یاد رہے کہ مسلمانوں کے علمی عروج کا راستہ بھی ترجمہ کی تحریکوں نے ہی ہموار کیا تھا۔ اب یہی طریقہ یورپی اقوام نے اپنے نئے سفر کے لئے چنا۔ اس دور میں عربی کتب کے وہ ذخیرے جو جنگوں میں برباد ہونے سے بچ گئے تھے، یورپی زبانوں میں ترجمہ کئے گئے اور انہی عربی کتب کے

---

[12] میکل اسکاٹ (م1232ء-Michael Scotus) نے ابن رشد کے علمی ذخیرے کا ترجمہ کیا۔ اس نے آکسفورڈ سے تعلیم حاصل کی۔ میکل کو آئر لینڈ میں پادری بننے کی پیشکش کی گئی لیکن اس نے اس سے معزرت کر کے اپنے علمی سفر کو جاری رکھا۔ عربی کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اس نے ابن رشد اور ابن سینا کی عربی کتابوں کا مطالعہ کیا اور ان میں سے بہت سی کتب کا ترجمہ کیا۔ فلسفے کے ساتھ ساتھ میکل نے ریاضی کے موضوع پر لکھی گئی عربی کتب کے بھی تراجم کئے۔

[13] تھامس ڈی اکوین (م1974ء - Tommaso d'Aquino) ایک ایطالوی کیتھولک پادری تھا۔ اس نے سیاسیات، مذہب، فلسفہ و دیگر علوم کے حوالے سے اپنی خدمات پیش کیں۔ فلسفہ کے موضوع پر اس کی سوچ کی تشکیل ابن رشد کے علمی کارناموں سے متاثر تھی۔ ارسطو کے فلسفے کی کتابوں نے بھی اس کی شوچ پر اثرات مرتب کئے۔

[14] راجر بیکن (م1292ء) کی زیادہ تر خدمات طبیعی علوم اور مشاہداتِ فطرت کے حوالے سے ہیں۔ اس کی خاص مہارت طبِ چشم کے موضوع پر تھی اور کہا جاتا ہے کہ اس مہارت کے حصول کے لئے اس نے مسلم سائینسدانوں کی اس موضوع پر لکھی ایک ایک کتاب کا مطالعہ کیا، خاص کر ابن الہیثم کی لکھی ہوئی کتب نے راجر کو علمی گہرائی عطا کی۔ بادشاہوں سے تعلقات کی خرابی اور علمی کام پر پابندیوں کے سبب راجر کے کئی سال علمی کاوش سے محروم رہ گئے۔

ترجموں نے یورپ کے اندھیروں کو روشنی فراہم کی۔

اس دور میں ایک اور قابلِ ذکر امر سیاحوں اور مشنریوں کا یورپی سرحدوں سے باہر دریافتیں کرنا تھا۔اسی دور میں مارکوپولو سلک روٹ کے ذریعے چین تک گیااور اس سے حوصلہ پاکر بہت سی مشنریاں اور بہت سے پادری بھی دنیا میں دور دور تک پھیل گئےاور دوسرے مذاہب، بشمول اسلام، اور ثقافتوں کو قریب سے دیکھنے لگے۔ اسلامی سپین کے زوال کے بعد استشراق کا یہ دور اپنے اختتام کی طرف بڑھا۔یہ وہ دور تھاجب نئی زمینوں اور نئے خطوں کی دریافتوں نے زور پکڑنا شروع کر دیااور استعماری تسلط وسعت حاصل کرنے لگے۔

دوسرا دور:

دوسرا دور یورپ پندھوریں صدی مسیحی کی بیداری سے اٹھارہویں صدی کے ختم تک تقریبا400 سوسال پر مشتمل ہے۔یہ دولتِ عثمانیہ ترکیہ کی اقبال مندی کا زمانہ ہے۔ 1453ء میں قسطنطنیہ پر مسلمانوں کا قبضہ ہوگیااور بہت سے یورپی ممالک عثمانیوں کے زیرِ نگین آگئے۔دوسری طرف یورپ میں عام بیداری پیدا ہوئی۔کلیسا کے خلاف بغاوتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ہر طرح کی سیاسی، تعلیمی اور سماجی اصلاحات شروع ہوئیں اور ان کا لب ولہجہ بھی اسلام کے خلاف بہت تلخ ہوگیا۔یہ تلخی عثمانی فتوحات کے خلاف جذباتِ نفرت کی پیداوار تھی۔

اس دور میں ان [مستشرقین] کے کارنامے یہ ہیں کہ انہوں نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر عربی کتابوں کے قلمی نسخے نکالے اور ان کو طبع کر کے شائع کیا۔ان کے ترجمے کیے اور اس کے لیے بادشاہوں نے خزانوں کے دروازے کھول دیئے۔عالموں نے اپنی عمریں وقف کر دیں۔ان کارناموں کے علاوہ خود یورپین زبانوں میں اسلام پر اس دور میں بکثرت کتابیں لکھی گئیں اور مطبع کی ایجاد نے ان کتابوں کی بکثرت اشاعت کو آسان کر دیا۔

اس دور میں یورپین اقوام نے مشرق کی سرزمین ایشیا وافریقہ پر قبضہ جمایا۔مستعمرات اور یورپین مقبوضات (Imperialism) کا یہی زمانہ ہے۔انڈونیشیا، ملایا، ہندوستان، صومالیہ اور جنوبی و مغربی و مشرقی افریقہ پر نیدرلینڈ، فرانس، جرمنی، برطانیہ اور اطالیہ کے تسلط کی ابتداء اس دور میں ہوئی۔جن علاقوں پر ان استعمار پسندوں نے قبضہ کیا تھا ان میں سے اکثر میں مسلمانوں کی بڑی بڑی ہی نہیں بلکہ اکثریت کی آبادیاں تھیں۔قبضہ اور تسلط قائم رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ ان کی زبانیں سیکھی جائیں ان کے عقائد وروایات سے واقفیت حاصل کی جائے۔ان کو آپس کے اختلافات میں الجھایا جائے۔ان میں مذہبی تعشف کو کم کرنے کے لیے ان کے یقین کو شک سے بدل دیا جائے۔ان کے ایمان وعقیدہ کو وہم اور غیر ثابت شدہ حقیقت قرار دیا جائے۔

ان مقاصد کے لیے یورپین ممالک خصوصا فرانس و جرمنی نے بڑی جدوجہد کی۔اس وقت ان کے سامنے اہم ترین مسئلہ ایک یہ بھی تھا کہ دولت عثمانیہ کی قوت کو کسی طرح توڑا جائے اس کام کے لیے یہ ضروری تھا کہ عربوں اور ترکوں کے مابین منافرت اور دشمنی پیدا کر دی جائے اور نہ صرف پیدا کر دی جائے بلکہ اس منافرت کو دوامی صورت دیدی جائے، اس مقصد کے لیے فرانس کے بادشاہ لولیس XIV نے بے دریغ دولت صرف

کر دی۔ مستشرقین اور مشرق شناسوں کو بڑی بڑی رقمیں دے کر ان سے عربی قومیت، عربی تمدن، عربی رسم و رواج اور عربوں سے متعلق دوسرے امور پر کتابیں لکھوائی گئیں۔ عربوں کی تعریف و توصیف کے گیت گائے گئے۔

اس زمانہ کے مستشرقین کا بہت بڑا طبقہ یہ باور کرانے کی دھن میں لگا ہوا نظر آتا ہے کہ اسلام سے پہلے ہی عرب بڑی عزت و شان کے مالک تھے۔ اسلامی تاریخ عربوں کے مجد و شرف کی تاریخ کا محض ایک باب ہے۔ اب تک جو تاریخیں لکھی جاتی تھیں وہ مسلمانوں کی تاریخ ہوتی تھی۔ عربوں کی الگ تاریخ کوئی نہیں لکھتا تھا۔ لیکن اس دور کی آخری دو صدیوں میں عربوں کو ترکوں کے خلاف تیار کرنے کی منظم جدوجہد یورپین حکومتوں نے مستشرقین کے ذریعہ شروع کی۔ عربی ممالک میں تحقیقاتی وفود کی ابتداء ہوئی، آثار قدیمہ نکالے جانے لگے اور عربوں کو وطن و قومیت کے لیے تیار کیا جانے لگا۔ جس کا نتیجہ تقریباً سو سال کے بعد بیسویں صدی کے اوائل میں خاطر خواہ نکلا۔

اس دور کی آخری دو صدیوں میں اسلام کے خلاف کتابوں اور رسالوں کی تالیف و اشاعت کا کام اطالیہ اور فرانس تک محدود نہ رہا بلکہ ان ہی ممالک میں تعلیم حاصل کرنے والوں کے ذریعہ یورپ کے دوسرے ممالک تک پھیل گیا۔ خصوصاً جرمنی اور نیدرلینڈ میں مطابع قائم ہوئے اور لوگ اس سلسلہ میں کام کرنے لگے۔ آخر میں انگلستان میں [بھی استشراقی] تعلیمی اور اشاعتی ادارے قائم ہو گئے۔

اس دور کے مشاہیر مستشرقین میں اولین نام مسٹر جی پوسٹل کا آتا ہے۔ یہ نارمنڈی کے ایک قصبہ باونٹوں میں 1505ء میں پیدا ہوئے اور 1581ء میں وفات پائی۔ ان کو بادشاہ وقت نے جاگیر بھی دی تھیں۔ انہوں نے ترکی اور دیگر اسلامی ممالک کے سفر کیے۔ بہت سی قلمی کتابیں خریدیں اور عربی و عبرانی زبان دانی اور مسلمانوں کے عقائد و رسوم پر متعدد کتابیں لکھیں۔ یہ ایک مذہبی پیشوا تھے اور مذہب عیسوی میں بعض باتیں پیدا کرنے کے جرم میں حکومت فرانس نے انہیں قید کر دیا تھا۔ ان کی وفات بھی قید خانہ میں ہوئی۔ ان کے علاوہ اس دور کے مشاہیر مستشرقین میں پی ویٹیبر (1213-1367)، بی ڈی بربیلو (1625–1695)، انطون گالان (1646–1815)، پادری ریٹاورڈو (1647–1720) اور پادری بارتیلمی (1716–1795) وغیرہ نے اپنے اپنے انداز میں اسلام پر کتابیں لکھیں۔

یہی وہ زمانہ ہے جبکہ کلیسا کا طلسم ٹوٹا اور اس دور کے آخر میں کچھ ایسے مستشرقین بھی پیدا ہوئے جنہوں نے اپنے پیشترو مستشرقین کی تردید کی۔ ساتھ ہی کچھ نہ کچھ نئے شبہات بھی پیدا کر دیے۔

تیسرا دور:

تیسرا دور انیسویں صدی کی ابتداء سے 1925ء تک ہے۔ اس دور میں عربی کتابوں کی تصحیح اور اشاعت کا کام زیادہ وسعت کے ساتھ پیدا ہوا۔ یورپ کی تقریباً ہر بڑی یونیورسٹی میں عربی اور اسلام کے مطالعہ کے لیے خاص شعبے قائم ہوئے۔ عربوں اور ترکوں کے مابین منافرت پیدا کرنے کی مہم بہت تیز کر دی گئی۔ اسلامی کتابوں کے ترجمے بکثرت شائع ہوئے۔ اس زمانہ میں اسلامی تحقیقات کے نام سے مسلمانوں کے اندرونی اختلافات

اور جدید فرق اسلامیہ پر بہت سی کتابیں تصنیف کی گئیں۔ عربی قلمی کتابوں کی تشریحی فہرستیں شائع ہوئیں۔ تقریبا ہر ملک میں ایشیائی سوسائٹیاں وجود میں آئیں۔

اس دور کے مستشرقین عربی متون کی تصحیح اور علوم ریاضیہ و تجربیہ کے تراجم کی اشاعت کے ساتھ ساتھ دو مقاصد کے لیے کام کرتے نظر آتے ہیں:

- (اول) عربوں اور غیر عربوں میں تفریق کے لیے عربوں کی تعریف و توصیف اور غیر عرب مسلمانوں پر الزامات کا التزام اور
- (دوم) مسلمانوں کی روایات اور ان کی تاریخ کو ناقابل اعتبار قرار دینے کی مساعی۔

اس دور میں قرآن مجید کے متعدد تراجم ہوئے۔ قرآن مجید کے الفاظ کی فہرستیں اور لغات القرآن بکثرت تیار کیے گئے۔ مسٹر جی فلوگل (1802–1870) اور مسٹر ہملٹین المتوفی 1824ء مترجم ہدایہ اسی دور کے علماء ہیں۔

اس دور کے مشہور مستشرقین میں سے ایڈورڈ ریہاسٹک (1819–1891)، مسٹر ہیوز مصنف "ڈکشنری آف اسلام"، تھامس کارلائل، ولیم ہوک مارلے، ایڈورڈ مہلر، ایل اسمنٹ، پادری ڈروم، سی ای ولسن، گولڈ زیہر، پادری کموشکو، جان جاک سدیو، لیونے کائتانی، پادری فاکاری، لازینون، بلاشیر اور نالینو وغیر ہم ہیں۔

مشہور پروفیسر پامر اور ان کے نامی گرامی شاگرد کرنل لارنس آف عریبیا اسی دور کے بزرگ ہیں۔

چوتھا دور:

چوتھا دور جو 1926ء میں امیر کاتیانی کی وفات سے اب تک ہے۔

اس دور میں تحقیقات اسلامی کا کام جن مستشرقین نے کیا ان میں نولدیکے اور ان کے شاگرد علامہ بروکلمان اور پروفیسر سخائو کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اسی طرح تھامس آرنلڈ، مسٹر جیکسن، مونٹ گمری واٹ، پروفیسر گویام، لی اسٹونج، مسٹر لیمب، مسٹر انڈوسن، پروفیسر مارگولیتھ، ڈینی راس، مسٹر اولیری، مسٹر لوکارٹ، مسٹر براؤن، مسٹر ہملیٹن گب، مسٹر لنڈائو اور مسٹر لولیس وغیر ہم نے تحقیقات اسلامی کا کام کیا اور کر رہے ہیں پادری زویمر المتوفی 1952ء بانی رسالہ مسلم ورلڈ بھی اس دور کے ہیں۔ جن کے متعلق خود مستشرقین کی یہ رائے ہے کہ **ان کے تعصب نے ان کی تصنیفات کا علمی مرتبہ ہی ختم کر دیا۔**

اس دور میں تحقیقات اسلامی کا دائرہ فقہ، اصول فقہ تک وسیع ہو گیا۔ اسلامی فرقوں کے حالات اور ان کے افکار کی طرف توجہ بڑھادی گئی ہے۔ اگرچہ اس سے پہلے بھی ان موضوعات پر کچھ نہ کچھ کام مستشرقین نے کیا ہے۔ مگر اس عہد میں توجہ ان موضوعات اور تصوف اسلامی کی طرف زیادہ بڑھادی گئی ہے۔

اس دور میں ایک بات یہ بھی پیدا ہو گئی کہ بڑی حکومتیں خدا بیزاری اور مذہب سے نفرت کے اصول پر قائم ہوئیں۔اس طرف توجہ 1925ء کے بعد سے ہوئی اور 1945ء کے بعد تو خدا بیزار مملکتوں کا مسلسل پروپیگنڈا خود عیسائیت کے لیے بلکہ دنیا کے تمام مذاہب کے لیے ایک مستقل خطرہ بن گیا۔

اس لیے باستثنائے چند مستشرقین یورپ کا لب و لہجہ اسلام کے خلاف یاوہ گوئی میں نسبتاً نرم ہو گیا۔اور اس وجہ سے مذاہب کی کانفرنسوں، تقریروں،اور مقالات صلح وآشتی میں اضافہ ہو گیا ہے۔

اگرچہ اس صورتحال کا اثر سب پر نہیں پڑا۔پادری سموئل زویمر اور ان کے ہمنوا پوری قوت کے ساتھ اسلام قرآن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلیہ وسلم کے خلاف لکھتے رہے وہ اپنے لب ولہجہ میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکے۔مگر پھر بھی دیگر مستشرقین کا ایک بڑا طبقہ اس خطرہ کو محسوس کر کے اپنی تحریروں کو مصلحتاً کسی قدر نرم کرنے پر مجبور ہو گیا ہے۔

حصہ چہارم: مستشرقین کی اقسام

(یہ حصہ اسامہ شعیب علیگ کی تحریر " لاستشراق والمستشرقین-آغاز وارتقاء" سے لیا گیا ہے۔اسامہ جامعہ ملیہ اسلامیہ،انڈیا میں بطور مدرس اپنی خدمات سرانجام دیتے ہیں۔)

گزشتہ کئی صدیوں سے مختلف مستشرقین اسلام اور اس کی تعلیمات کے سلسلے میں تحقیق وتصنیف میں مشغول ہیں۔ان کو نظریات وافکار اور فطرت کی بنیاد پر درج ذیل قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

سلیم الفطرت مستشرقین

بعض سلیم الفطرت مستشرقین ایسے بھی تھے جنہوں نے اسلام کی آفاقی تعلیمات کو فطرت کے قریب پایا اور اسے آسمانی ہدایت سمجھ کر اللہ تعالی کے سامنے سر تسلیم خم کر گئے اور اسلام لے آئے۔پھر ان کی پوری زندگی اسلام کے مطابق گزری اور انہوں نے مستشرقین کی جانب سے اسلام پر ہونے والے اعتراضات کا دنداں شکن جواب دیا۔جیسے

- شیخ عبداللہ(William Henry Quilliam, 1856-1932)
- رسل
- ویب (Mohammed Alexander Russell Webb, 1846-1916)،
- ابو بکر سراج الدین (Martin Lings,(1909-2005)،
- ناصرالدین دینیہ(Alphonse-Etienne Dinet,1861-1929)،
- رحمت اللہ الفاروق(Lord Hadly Alfaruque,1855-1935)،
- علامہ محمد اسد(Sylvius Leopold Weiss,1900-1992)،
- ڈاکٹر عمر رالف ایر نفلس(Dr. Baron Omar Rolfvon Ehrenfels,1901-1980)،
- خالد شیلڈرک(Bertram William Sheldrake,1800)،
- مریم جمیلہ (Margaret Marks,1934-2002)وغیرہ۔

تحقیق وتصنیف کے شائق مستشرقین

مستشرقین کی ایک بڑی تعداد ایسی ہے جن کا بنیادی مقصد صرف علمی میدان ہیں تحقیق وتصنیف کرنا اور اس سے عوام الناس کو فائدہ پہنچانا ہے۔ایسے لوگوں نے تیرہویں صدی کے بعد مشرق سے علم وادب کے ذخیرے کو ترجمہ کر کے مغرب میں پہنچایا۔ان کو اسلام سے کوئی دشمنی اور عداوت نہیں ہے بلکہ وہ اپنی علمی پیاس بجھانے کے لیے مسلمانوں کے مختلف ممالک کے علمی مراکز میں جاکر قرآن وحدیث، فقہ، تاریخ اور دیگر علمی

کتابوں پر ریسرچ کرتے ہیں۔ان لوگوں نے مردہ اقوام کی گم شدہ تاریخ کی چھان بین کی۔آثارِ قدیمہ کی مدد سے ان کے قدیم رسوم ورواج، زبان وادب کا بغور مطالعہ کیا اور نتائج اخذ کیے۔اسلام و عربی لٹریچر کے تحفظ کے لیے بڑی کوششیں کیں اور اپنی علمی تحقیق کے نتیجہ میں سینکڑوں یادگار کتابیں مسلمانوں کو دی۔

ان کتابوں میں 'نجوم الفرقان فی اطراف القرآن(1842)اور المعجم المفہرس لالفاظ الحدیث النبوی(1936)'اہم ہیں۔

اوّل الذکر کو'فلوجل الامانی (Gustav Leberecht Flugel,1802-1870)'نے لکھا تھا۔اس کتاب سے محمد فواد الباقینے 'المعجم المفہرس لالفاظ القرآن'،لکھتے وقت استفادہ کیا تھا۔ثانی الذکر کے مولف الدکتورایونسک(A.J.Wensinck) ہیں۔

دیگر مستشرقین میں

البرٹ اعظم(Albert Azam, 1293-1335

ریمنڈلول(Reymond Lol,1235- 1315)،

میجل اسکاٹ(M.Scot) ،

گوستاویبون(Gustave Le Bon,1841–1931)،

توماس ایڈورڈ(Thomas Edwards,1652-1721) اور

راجر بیکن(R.Bacon) وغیرہ

مشہور ہوئے۔

اسلام دشمن اور تعصب پرست مستشرقین

مستشرقین کا یہ طبقہ ان متعصب یہودی اور عیسائی محققین پر مشتمل ہے، جن کا بنیادی مقصد صرف اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانا ہے۔ان لوگوں نے اپنی زندگی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اپنے عقائد و نظریات کے فروغ کے لیے وقف کردی اور مشرق سے جو بھی مفید چیزیں اخذ کی گئی ہیں ان کو علمی دیانت کے برخلاف،ان کے ماخذ و مصادر کو پوشیدہ رکھ کر انہیں مغرب سے منسوب کردیا۔ڈاکٹر غلام جیلانی برق لکھتے ہیں:

''یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلمان بارود، قطب نما، الکحل، عینک اور دیگر بیسیوں اشیاء کے موجد تھے، لیکن بقول رابرٹ بریفالٹ مورخین یورپ نے عربوں کی ہر ایجاد اور انکشاف کا سہرا اس یورپی کے سر باندھ دیا ہے جس نے پہلے پہل اس کا ذکر کیا تھا۔ مثلاً قطب نما کی ایجاد ایک فرضی شخص فلویو گوجہ کی طرف منسوب کردی۔'ولے ناف کے آرنلڈ'،کو الکحل اور بیکن کو بارود کا موجد بنادیا۔صرف یہی نہیں بلکہ بعض اوقات عربوں کی تصانیف پر اپنا نام بطور مصنف جڑدیا۔انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں لفظ جیبر(Geber)کے تحت ایک مترجم کا نام دیا ہوا ہے، جس نے اسلام کے مشہور

ماہر کیمیاداں جابر بن حیان کے ایک لاطینی ترجمے کو اپنی تصنیف بنالیا تھا۔ یہی حرکت سلرنو کالج کے پرنسپل قسطنطین افریقی (1060) نے بھی کی تھی کہ ابن الجزار کی 'زادالمسافر' کا لاطینی ترجمہ Viaticum کے عنوان سے کیا اور اس پر اپنا نام بطور مصنف لکھ دیا۔

مفاد پرست مستشرقین

مستشرقین کی یہ وہ قسم ہے جن کے پیشِ نظر کوئی اعلیٰ علمی مقاصد نہیں ہوتا، بلکہ وہ مادی مفادات، عہدوں، سستی شہرت اور دنیاوی مال و دولت کے لالچ میں اس میدان میں قدم رکھتے ہیں اور چوں کہ اہلِ مغرب مسلمانوں کے خلاف کی گئی تحقیق کو، چاہے وہ کتنی ہی غیر معیاری، بے بنیاد اور علمی و عقلی لحاظ سے پست ہی کیوں نہ ہو، ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں۔ اس وجہ سے ایسے لوگ ہمیشہ ان چیزوں کی تلاش میں رہتے ہیں جن کے ذریعے سے وہ اہل مغرب سے اپنے مفادات سمیٹ سکیں۔ اس طرح کے لوگوں میں ہندوستان کے سلمان رشدی اور تسلیمہ نسرین وغیرہ بھی شامل ہیں۔

علمی معیار کے اعتبار سے مستشرقین کی اقسام

مولانا شبلی نعمانی نے مستشرقین کو تین اقسام میں تقسیم کیا ہے:

۱ - عربی زبان و ادب، تاریخ اسلام اور اس کے ماخذ سے ناواقف مستشرقین، جن کی معلومات براہ راست نہیں ہوتیں، بلکہ وہ تراجم سے مدد لیتے ہیں اور قیاسات و مفروضوں سے کام لیتے ہیں۔

۲ - وہ مستشرقین جو عربی زبان و ادب، تاریخ، فلسفہ اسلام سے تو واقف ہوتے ہیں، مگر مذہبی لٹریچر اور فنون مثلاً اسماء الرجال، روایت و درایت کے اصولوں، قدیم ادب اور روایات سے واقف نہیں ہوتے۔

۳-وہ مستشرقین جو اسلامی علوم اور مذہبی لٹریچر کا مطالعہ کر چکے ہوتے ہیں، لیکن اپنے مذہبی تعصبات کو دل سے نہیں نکال سکے۔ وہ اسلامی علوم کے بارے میں تعصب، تنگ نظری اور کذب و افترا سے کام لیتے ہیں۔ (شبلی نعمانی، سیرۃ النبی: 65/1)

حصہ پنجم: مقاصد

اس حصہ میں مولانا نے استشراق کے مقاصد پر روشنی ڈالی ہے۔

ذیل میں دی گئی گفتگو سے واضح ہوتا ہے کہ کچھ ایسے مستشرقین بھی تھے جن کے پیشِ نظر صرف **علمی مقاصد** تھے یا **اپنی قوم کی ترقی** کے لئے مناسب طریقوں سے علم کی ترویج تھا۔ لیکن ان کی تعداد بہت کم تھے اور ان کا تعلق ابتدائی ادوار سے تھا۔ بعد میں آنے والے اکثر استشراقی محققین کے پیشِ نظر مقاصد یہ رہے:

- **مسلمانوں میں شکوک وشبہات پیدا کرنا**۔ اس مقصد کے حصول کے لئے انہوں نے کتاب اللہ، رسول اللہ اور تاریخِ اسلام کے حوالے سے من پسند اعتراضات گھڑے اور قلمبند کر دئے۔
- **عیسائیت کی ترویج**۔ اس مقصد کا حصول اوپر دئے گئے پہلے مقصد سے بہت حد تک ہموار ہو گیا۔
- **استعمار کی راہ ہموار کرنا**۔ اس حوالے سے انہوں نے مسلمانوں میں فرقہ واریت کو فروغ دینے کا راستہ اختیار کیا۔ خلافتِ اسلامی کے خلاف جزبات بھڑکائے اور مسلمانوں کی قومیت کا زہر پلانے کی کوشش کی۔

ان مقاصد کے حصول کے دوران انہوں نے عمداً اور غیر عمداً بہت سی علمی کوتاہیاں بھی کیں جن کی کچھ مثالیں ذیل میں دی گئی ہیں۔

کسی ذی ہوش آدمی کا ارادی عمل بغیر علّت غائی یعنی مقصدِ عمل کے ممکن نہیں ہے۔ اس لیے یہ کہنا صحیح نہیں ہو سکتا کہ مستشرقین کا عمل تحقیقاتِ اسلامی کسی مقصد کے بغیر ہوتا رہا ہے یا ہو سکتا ہے یقینا یہ ساری محنت اور حکومتوں اور اوقاف کی طرف سے اتنے بڑے پیمانہ پر کام بھی، کوئی مقصد رکھتا ہے اور یقیناً ان اعمال کا کوئی مقصد ہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ اس کا مقصد صرف تلاشِ علم ہو سکتا ہے لیکن یہ خیال اس لیے محض باطل ہو جاتا ہے کہ ہم قدیم زمانہ سے اس کام میں زیادہ تر ان ہی حضرات کو منہمک پاتے ہیں جو عیسائیت کے پُر جوش مبلغ ہیں اور آج تک اکثریت ان ہی مبلغین کی، اس کام میں مشغول نظر آتی ہے، جو دین مسیحی کے بہترین مبلغ ہیں۔ ذرا ان چند ناموں پر غور کیجئے یہ سب مسیحی پادری ہیں اور مدتوں تک مرتاض راہب رہ کر انہوں نے تربیت پائی ہے:

- پادری ایوجی المتوفی 1895ء
- پادری کوش المتوفی 1895ء
- پادری ژی کوپر المتوفی 1904ء
- پادری جولیان المتوفی 1911ء
- پادری الیانو المتوفی 1589ء
- پادری ریلو المتوفی 1848ء
- پادری مارٹن المتوفی 1880ء
- پادری بلن المتوفی 1891ء

- پادری لامنس المتوفی 1938ء
- پادری بروبرا المتوفی 1919ء
- پادری کولنگیٹ المتوفی 1938ء
- پادری میکارتھی المولود 1913ء
- پادری لاپیرے المتوفی 1950ء
- پادری بولومواے المتوفی 1929ء
- پادری مونٹوڈے المولود 1880ء
- پادری زیموفین المتوفی 1928ء
- پادری ہنری چارلس المولود 1900ء
- پادری ڈیورنڈا المتوفی 1928ء
- پادری فلیش المولود 1904ء
- پادری مالون المتوفی 1938ء

یہ سب مبلغ (مشنری) اور پادری ہیں اور کلیسا کے مذہبی عہدہ دار ہیں۔ انہیں بیش قرار تنخواہیں کلیسا اور اوقاف کلیسا سے ملتی رہی ہیں۔

ظاہر ہے کہ ایک مسیحی راہب اور کلیسا کا عہدے دار کلیسا کی تنخواہ لے کر اسلام پر تحقیقات کسی مقصد اور کسی جذبہ کے ماتحت کر سکتا ہے۔ اور یورپ کی استعماری حکومتوں نے ان پر جو کروڑوں روپے خرچ کیے یا کر رہی ہیں ان کا کیا مقصد ہو سکتا ہے؟

عربی زبان سے ریاضیات، فلکیات، کیمیا، طب، نباتیات اور حیوانیات کی کتابوں کے ترجمے کرنے والوں کو شاید یہ کہہ دیا جائے کہ محض تلاشِ علم کے لیے یہ سب کچھ کر رہے ہیں یا کرتے رہے ہیں لیکن ایسے حضرات بہت ہی کم ہیں اور ہمارے موضوع سخن سے اس مقالہ میں یہ لوگ خارج ہیں۔

اسلامی عقائد، قرآن حکیم، اسلامی تاریخ، سیرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلیہ وسلم اور اسلامی تصوف پر تحقیقات کرنے والے ان مسیحی خانقاہ نشینوں اور مبلغوں کا مقصد صرف تلاشِ علم وہنر کیسے ہو سکتا ہے؟ مستشرقین کی اسلامی تحقیقات کا مقصد جو ان تحریروں سے صاف ظاہر ہوتا ہے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈہ، استعمار کے لیے راستہ کی ہمواری اور مسلمانوں میں تفریق پھیلانے کی جدوجہد کے سوا کچھ اور نظر نہیں آتا۔ اس مقصد کے لیے وہ بڑے خلوص اور تندہی سے کام کرتے ہیں تحقیق کے نام سے منافقوں اور اسلام دشمن اشخاص کے قدیم اقوال ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نکالتے ہیں۔ اور چونکہ عرب عیسائیوں اور یہودیوں کے اکثر نام مسلمانوں کے سے ہوتے ہیں۔ اس لیے بڑی آسانی کے ساتھ وہ دھوکہ دینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ مسلمان حکومتوں نے ہمیشہ سے آزادی رائے دی ہے۔ اس لیے ہزاروں یہودیوں اور عیسائیوں نے طرح طرح کی فضول اور مضر تحریریں لکھی ہیں اور آج یہ تحریریں اسی طرح پیش کی جاتی ہیں۔ جیسے کسی مسلمان عالم دین کی لکھی ہوئی کتاب ہو۔

اس کے علاوہ خود مسلمانوں میں کچھ لا مذہب اور زندیق قسم کے افراد بھی داخل یا پیدا ہوتے رہتے ہیں، یہ لوگ ان کی تحریروں پر خاص توجہ کرتے ہیں مثلاً بشار بن بود، ابونواس جیسے مشاہیر فُساق اور زنادقہ کی تحریریں "کتاب الاغانی"، "کتاب اخوان الصفا"، ابونعیم کی "کتاب الفتن" اور اس قسم کی دوسری کتابوں سے مواد لیتے ہیں۔

بعض بالکلیہ جعلی کتابیں جو کسی قدیم مصنف کی طرف منسوب کر دی گئی ہیں۔ مثلاً عبداللہ بن ابن داود کی طرف منسوب کتاب "المصحف"، زبیر بن بکار کی طرف منسوب "کتاب نسب قریش"، بو علی سینا کی طرف منسوب "رسالہ حشر الاجسار" وغیرہ ان کے مقاصد کے لیے بڑی کار آمد ثابت ہوتی ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ متونِ کتاب کی طباعت و اشاعت میں انہوں نے جو کام کیا ہے۔ فہرست سازی اور اشاریہ نویسی میں جو محنتیں انہوں نے کی ہیں وہ لائق صد آفریں ہیں۔ ان کی محنت و مساعی سے بہت سی نایاب اور قیمتی کتابیں چھپ کر ہمارے لیے قابلِ حصول ہو گئیں۔

لیکن جہاں انہوں نے ترجمہ و تحشیہ کا کام کیا ہے یا کتاب لکھی ہے، وہاں کبھی بالارادہ اپنے جذبہ عداوت کے ماتحت اور کبھی محض اپنی جہالت سے کتاب کو کیا سے کیا بنا کے بھی رکھ دیا ہے اور عجیب عجیب گل کھلائے ہیں۔ مثال کے لیے مشہور مستشرق فلوگل کو لیجئے۔ انہوں نے قرآن مجید کا ایک نسخہ چھاپا۔ الفاظ کی فہرست مرتب کی اور 1842ء میں ایک وسیع لغت الفاظ قرآن مجید کا شائع کیا۔ اس لغت میں انہوں نے 39 الفاظ کے غلط عربی مادے لکھ دیئے اور نتیجتاً معانی بدل ڈالے مثال کے لیے ان پانچ الفاظ کو دیکھیے:

(1) اثرن کا مادہ "ا-ث-ر" قرار دیا حالانکہ اس کا صحیح مادہ فعل "ث-و-ر" ہے۔

(2) المخاص کا مادہ "خ-و-ص" قرار دیا حالانکہ اس کا صحیح مادہ فعل "م-خ-ص" ہے۔

(3) استبقوا کا مادہ "ب-ق-ی" قرار دیا حالانکہ اس کا صحیح مادہ فعل "س-ب-ق" ہے۔

(4) وقرن کا مادہ "ق-ر-ن" قرار دیا حالانکہ اس کا صحیح مادہ فعل "ق-ر-ر" ہے۔

(5) مقیلا کا مادہ "ق-و-ل" قرار دیا حالانکہ اس کا صحیح مادہ فعل "ق-ی-ل" ہے۔

اس تبدیلی سے معانی بالکل بدل گئے۔ یہ وہ مسٹر فلوگل ہیں جن کو مستشرقین کے نزدیک سندِ مستند کا مقام حاصل ہے۔

چونکہ ہمیشہ سے یہ اعتراض مسیحیت پر کیا جاتا رہا ہے کہ انجیل مقدس کے نام سے جو کتاب پیش کی جاتی ہے وہ حضرت عیسیٰؑ کی غلط اور فرضی سوانح عمری ہے۔ اس میں ایک الفاظ بھی وحی الٰہی کا نہیں ہے اور یہ اعتراض بالکل صحیح ہے[15]۔ دنیا میں کہیں وحی الٰہی کا ایک لفظ بھی بجز ناقرآن مجید کے موجود نہیں ہے۔ یہ امر واقعہ ہے اس کا کوئی جواب عیسائی مبلغین کے پاس نہیں ہے۔ اس لیے مستشرقین نے اپنی تحقیقات اسلامی کا سارا زور اس پر لگا دیا ہے کہ قرآن مجید بھی اصلی نہیں ہے اور قابلِ اعتماد نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے وہ عجیب عجیب دلاول پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً علامہ گولڈ زیہر اپنی

[15] ترجمہ شدہ بائیبل یقینا وحی الہی کی نا تو متبادل ہے اور نہ اصل وحی کی ترجمان۔ اس میں وقت کے ساتھ ساتھ عیسائی علماء اور ان کے مذہبی اکابرین کے افعال و اقوال جمع ہوتے رہے ہیں۔ ان اکابرین نے آزادی کے ساتھ اپنے دین میں تبدیلیاں کیں جو اب ان کے دین کا نا قابلِ الگ جز بن چکی ہیں۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ بائیبل میں کچھ آیات ابھی بھی اصل وحی سے مطابقت رکھنے والی ضرور موجود ہوں گی۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے علماء نے اسرائیلیات (یعنی اہلِ کتاب کی وہ روایات جو اسلامی تعلیمات کے منافی نہ ہوں) کے استعمال کو کسی حد تک قبول کیا ہے۔ لیکن اس امر میں حد درجہ احتیاط ضروری ہے اور ایسی آیات کے استعمال سے پہلے مکمل علمی پختگی درکار ہے۔

کتاب "مذاہب التفسیر الاسلامی" میں لکھتے ہیں کہ قرآن مجید کے ایک لفظ کی صحت بھی قابل اعتماد نہیں۔ کیونکہ ابتدا جب اسے لکھا گیا تھا تو حروف پر نقطے نہیں تھے۔ اس لیے لوگوں نے نہ جانے کیا لکھا تھا اور پڑھا۔

ذرا غور فرمایئے اس فاضل مستشرقین نے کیا بات پیدا کی ہے۔ جس قوم میں مادر زاد اندھے حافظ رہے ہوں اور جس میں آج تک استاد سے شاگرد کی طرف علم کی منتقلی بذریعہ صوت آواز ہو اس میں نقطہ کی اہمیت کیا ہے۔ صحابہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلیہ وسلم کی زبانِ اقدس سے آواز سنتے تھے یا لکھی ہوئی تحریروں سے قرآن مجید یاد کرتے تھے۔ اور آج تک کسی مسجد اور کسی مدرسہ میں قرآن مجید بغیر معلم کی آواز کے بلیک بورڈ پر لکھ کر پڑھا جاتا ہے۔ قرآن مجید کی آواز مد، سکون، وقف، سکتہ یہ سب کچھ بذریعہ روایت محفوظ ہے اس کے لیے حروف اور نقطہ کی ضرورت بھی کہاں پڑتی ہے؟

شاید علامہ گولڈ زیہر کا مقصد یہ ہے کہ جب وحی آتی تھی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلیہ وسلم اسے لکھوا کر اس لیے محفوظ فرما دیتے تھے کہ لوگ آکر مسجد میں رکھے ہوئے اس نوشتہ کو پڑھ لیا کریں اور آپ کسی کو زبان سے کچھ نہیں سنایا کرتے تھے۔ یہی ہوتا تو حضرت عبداللہ بن ام مکتوم نابینا صحابی نے قرآن مجید کیسے یاد کیا اور ناحرف شناس تو بہت سے حافظ قرآن صحابہ میں موجود تھے۔

اسی طرح کی مہمل دلیلوں اور مغالطوں کے ذریعہ حضرات مستشرقین یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ تورات شریف اور انجیل مقدس کی طرح قرآن مجید بھی دنیا سے ناپید ہو گیا۔ اسی طرح سیرت طیبہ، اسلامی تاریخ اور فقہ اسلامی میں طرح طرح کے شک پیدا کرنے کی کبھی بالارادہ کوششیں کرتے ہیں اور کبھی نقصِ مطالعہ اور غرورِ علم و فضل کی آمیزش سے ایسی باتیں لکھ جاتے ہیں۔

سنئیے، ایک مبلغ اور مستشرق ہیں "لوئی ونڈر مین"۔ انہوں نے ایک علمی مجلس میں یہ اعتراض کیا کہ ام المومنین بی بی خدیجۃ الکبریٰ کے گھر حضرت زبیر اکثر جاتے تھے۔ اور کبھی کبھی وہیں سو بھی جایا کرتے تھے۔ ام المومنین ان کے سر میں کنگھی بھی کر دیتی تھیں حالانکہ اسلام میں کسی عورت کا غیر مرد سے اس طرح خلا ملا جائز نہیں ہے۔ "اس اعتراض کے بعد جب انہیں بتایا گیا کہ حضرت ام المومنین بی بی خدیجۃ الکبریٰ حضرت زبیر کی حقیقی پھوپھی تھیں اور ان ہی نے بچپن سے ان کو پالا تھا کوئی غیر نہ تھیں تو نہایت معصومیت سے فرمایا "اچھا یہی بات ہو گی۔"

مثالوں سے بات بڑی طویل ہو جائے گی اس لیے اب میں اس گفتگو کو ختم کرتا ہوں۔

حصہ ششم: خلاصہِ کلام

(1) عیسائیوں اور یہودیوں کو ہمیشہ ہی سے اس کا صدمہ رہا ہے کہ اسلام نے شام و عراق، مصر و مراکش وغیرہ میں کیوں قدم جما لیے اس کا انتقام لینے کے لیے انہوں نے تلوار کے ساتھ ساتھ قلم سے بھی کام لیا اور کام لے رہے ہیں اور ہمیشہ کام لیتے رہیں گے۔ مسلمانوں کو چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔ ان سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ شکایت کرنا بزدلی ہے اور چوکنا رہنا ہوشیاری و دانائی۔

(2) عیسائی مبلغین جو ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں وہ کسی مذہب کے مبلغ نہیں ہیں۔ کبھی وہ استعماری حکومتوں کے ہراول دستہ تھے اور اب یورپین تہذیب و تمدن کے نقارچی ہیں جنہیں بیش قرار تنخواہیں سیاسی مصالح اور تجارتی مقاصد کی تکمیل کے لیے دی جاتی ہیں یہ مبلغ بھی ہوتے ہیں اور کبھی کوئی اور روپ بھی دھار لیتے ہیں۔

(3) کسی کی بات کو بغیر تنقیح و تحقیق قبول نہیں کیا جا سکتا اس لیے مستشرقین کے علم و فضل سے مرعوب ہو کر کوئی بات قبول نہیں کی جا سکتی۔ رہی اچھی اور سچی بات تو یہ دوست سے ملے یا دشمن سے **كلمة الحق ضالة المومن اينما وجدت فهو احق بها**۔
(کلمہ حق مومن کا کھویا ہوا مال ہے۔ جہاں کہیں مل جائے مومن ہی اس کا زیادہ حق دار ہے)۔

موجودہ زمانے میں بھی استشراق کا سلسلہ جاری ہے لیکن اس کی نوعیت و مزاج میں فرق واقع ہوا ہے۔

اس زمانے میں **حکومتی سطح پر** ہونے والا جانبارانہ اور استعماری استشراقی کام اب کھلے الفاظ یا آسانی سے دکھائی دینے والے طریقوں سے نہیں بلکہ خفیہ انداز میں ہوتا ہے۔ قوموں اور مذاہب، خاص کر مسلمان قوم اور مذہبِ اسلام، کی ایک مخصوص تصویر بنانے کا کام آج بھی جاری ہے۔ اس کے پیچھے آج بھی سیاسی، اقتصادی اور معاشی مقاصد کارفرما ہیں۔

مغربی ممالک کی جامعات میں ہونے والی اکثر تحقیقوں کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ رفتہ رفتہ ان میں غیر جانبداری بڑھ رہی ہے۔ اس کا ایک سبب وہ علمی معیارات ہیں جو ان جامعات کے لئے لازم و ملزوم ٹھہرائے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ امر بھی قابلِ غور ہے تحقیق کرنے والوں میں بہت سے مسلمان شامل ہیں (جن میں نا صرف مشرقی بلکہ مغربی ممالک کے مسلمان بھی موجود ہیں)۔ یہ بھی قابل ذکر بات ہے کہ جامعات ہیں محققین کی اکثریت کسی بھی قسم کے باہری ڈباؤ کے بغیر اپنا کام کرنے پر قادر ہے۔ البتہ اس حوالے سے یہ نہیں کہا جاتا کہ سارا ہی کام غیر جانبدارانہ ہوتا ہے۔ آج بھی مائیکل کک اور پیٹریشیا کرون جیسے مصنف موجود ہیں جو انتہائی قابل مذمت علمی کوتاہیاں کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔ اگر ایک کم علم محقق یا عام آدمی ان کی کتب پڑھے تو گمراہی کا شکار ہونے کا اندیشہ رکھتا ہے۔ لیکن یہ خوش آئیند امر یہ ہے کہ غیر جانبدار محققین ان کی کوتاہیوں کا پردہ بلادریغ چاک کر دیتے ہیں، جیسا کہ انہوں نے مائیکل کک اور پیٹریشیا کے معاملے میں کیا۔[16]

[16] ان دونوں مستشرقین نے اسلامی تاریخ اور پیغمبرِ اسلام کے خلاف شکوک و شبہات پیدا کرنے کے لئے ایک کتاب لکھی جس کی تصنیف میں صرف غیر مسلم کتب و دستاویزات سے ہی استفادہ کیا گیا۔ یہ طریقہ تاریخ کی تحقیق کے اصولوں کے منافی تھا اور اپنی جانبداری کے سبب ناقابلِ قبول قرار دئے جانے کے قابل تھا۔ لیکن ان کی ناکامی کا منہ بولتا ثبوت خود ان کے شاگرد محققین تھے جنہوں نے اپنے استادوں ہی کا طریقہِ تحقیق اختیار کیا (یعنی صرف غیر مسلم کتب سے استفادہ) لیکن اپنے غیر جانبدارانہ رویے کے باعث اپنے اساتذہ ہی کے بنائے ہوئے افسانے کی دھجیاں بکھیر

ایک عام آدمی کے لئے سمجھنے کی بات:

میرے خیال اس مقالے میں کی جانے والی بحث کے تناظر میں ایک عام آدمی کہ لئے مندرجہ ذیل باتیں ذہن میں رکھنا انتہائی ضروری ہیں۔

- استشراق اور مستشرقین مختلف ادوار میں مختلف مقاصد کے پیشِ نظر اسلام اور مشرق کے بارے میں تحقیق کرتے رہے ہیں۔ان کی ان تحقیقات کو اسے زمان و مکان کے تناظر میں دیکھنا چاہیے تاکہ درپردہ مقاصد آشکار ہو سکیں۔
- آج کل کے دور سے ملحدین و مستشرقین اکثر انہی پرانے اعتراضات کو دہرا کر مسلمانوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں جن کے جواب ہمارے علماء صدیوں پہلے دے چکے ہیں۔ ملحدین و مستشرقین عام انسانوں (مسلم و غیر مسلم) کی کم علمی کا فائدہ اٹھا کر اپنے مقاصد کے حصول کی کوشش کرتے ہیں۔ایسے اعتراضات سامنے آنے کی صورت میں ہمیں علماء سے رابطہ کرنا چاہیے اور اپنے اسلاف کی کتب مٹی جھاڑ کر دوبارہ کھولنا چاہیے۔
- ہمیں اپنے علم میں ترقی کے لئے کوشاں رہنا چاہیے تاکہ اپنے ایمان و اپنی تہذیب پر ہونے والے حملوں کو سمجھ سکیں اور مناسب راہِ عمل اختیار کر سکیں۔دینی علم ہمارے ایمان کی مضبوطی کا سبب بنے گا اور عصری علوم میں مہارت ہمیں اپنا کھویا ہوا مقام دلانے میں مددگار ہو گی۔
- ہمیں نا صرف خود علم کو حصول کے لئے مجاہدہ کرنا ہو گا، بلکہ اسے دوسروں تک پہنچانے کے لئے بھی کامل جدوجہد کرنا ہو گی۔یہ کام انفرادی سطح پر بھی کرنا ہو گا اور اجتماعی و قومی سطح پر بھی۔اسی حوالے سے ہمیں اپنی علمی درسگاہوں میں تحقیقی کام کو بھرپور فروغ دینا ہو گا۔
- آج کے زمانے کو اگر میڈیا کا زمانہ کہا جائے تو یہ کچھ غلط نہ ہو گا۔جس طریقے سے میڈیا کے ذریعے اسلام اور مسلمانوں کی کردار کشی عام ہو رہی ہے، یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ سچ اور مثبت رویوں کی ترویج و اشاعت میں اپنا کردار ادا کریں۔یہ کام سوشل میڈیا اور مین اسٹریم میڈیا، دونوں ذرائع سے کیا جانا ضروری ہے۔
- اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی نہایت ضروری ہے کہ ہم اخلاقِ فاضلہ کے حصول کی سعی اور جدوجہد میں خود کو سرگرم رکھیں۔دنیا میں سرفرازی مسلمانوں کا مقدر صرف تبھی بن سکتی ہے جب ہم بحیثیتِ قوم و ملت یہ اخلاقِ فاضلہ دوبارہ حاصل کر لیں گے۔ہمارا اخلاق ہمارا بہترین ترجمان بنے گا۔

دیں۔اس عمل کے دوران انہوں نے مائیکل کک اور پیٹریشیا کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ کتب و دستاویزات سے استفادہ کیا اور ان کی 200 صفحے کی کتاب کے مقابلے میں اپنا 800 صفحے کا مقالہ پیش کیا۔ محققین کی ایک کثیر تعداد نے بھی مائیکل اور پیٹریشیا کی کتاب کو علمی کوتاہی یعنی Intellectual dishonesty قرار دیا۔

اس حوالے سے دو امور نہایت قابلِ غور ہیں:

- اپنے افسانوں کی حقیقت سامنے آنے کے باوجود مائیکل کک اور پیٹریشیا کرون اسلام کے بارے میں اپنے قلم تھامے رہے اور آکسفورڈ یونیورسٹی پریس جیسے بڑے ادارے نے بھی ان کی کتب پبلش کرتے رہے۔ محشیٰ کو خود ان کی قرآن کے تعارف کے حوالے سے ایک کتاب پڑھنے کا تجربہ ہوا جس سے معلوم ہوا کہ جو غلط موقف پہلی کتاب میں موجود تھا، اسی کا اثر اور بدبو بعد کی کتب سے بھی نہ جا پائے۔
- آج کل کے بعض آزاد محققین (جن کا تعلق مشنریوں سے ہے نہ کہ جامعات سے)، اسی پرانے افسانے کو دوبارہ سے اچھال رہے ہیں۔کم علم حضرات جو یہ نہیں جانتے کہ اسے خود غیر مسلم محققین ہی غلط ثابت کر چکے ہیں، اس سے گمراہ ہونے کے خطرہ میں ہیں۔

یہ میری ناقص رائے کے مطابق چند ضروری گزارشات تھیں جن کہ بارے میں بالکل بھی یہ دعوی نہیں کیا جا سکتا کہ یہ تمام مطلوبہ خصائص کا احاطہ کرتی ہیں۔البتہ اس امر میں کوئی شک نہیں ہے یہ لکھتے وقت میرے پیشِ نظر امتِ مسلمہ کا ایک روشن وتابندہ مستقبل ہے۔اس مستقبل کے حصول کے لئے ہم سب کو مل کر اپنا کردار ادا کرنا ہوگا۔اللہ ہماری مدد و نصرت فرمائے اور ہمیں دنیا اور آخرت میں سرفرازی و کامیابی عطاء فرمائے۔آمین۔